جلد ۶۱
عدد ۴

جنوری 1964

مکمل

ماہنامہ

ترجمان القرآن

خرداد سے لیکر جون تک پرچہ
شائع نہیں ہوا

مرتبہ

اسلام کے سیاسی پہلو پر نادر کتب

اسلامی ریاست

از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

— اسلام کے نظریہ سیاسی کی مستند تشریح

— اسلام کے نظام ریاست کی مکمل تصویر

— علماء، طلباء، قانون و سیاست کے لیے ایک خزینۂ علم۔

قیمت قسم اعلیٰ: بارہ روپے سستا ایڈیشن آٹھ روپے

الجہاد فی الاسلام

از: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

— اسلام کے نظریۂ جہاد پر ایک مدلل و مستند کتاب

— اسلامی قوانینِ جنگ کا بین الاقوامی اور غیر مسلم اقوام کے قوانینِ جنگ سے موازنہ

— اردو میں جہادِ اسلامی پر پہلی محققانہ اور بے مثال کتاب

قیمت قسم اعلیٰ ۱۱ روپے سستا ایڈیشن ۷٫۵۰ نئے پیسے

تحریکِ اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل

— مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی —

— غلبۂ کفر میں اسلامی تحریک کا طریقۂ کار

— ایک جمہوری ملک میں اسلامی انقلاب کی سبیل

— اسلامی انقلاب پاکرنیوالوں کے لیے ایک رہنما کتاب

— برصغیر پاک و ہند میں پچھلی ربع صدی کی کشمکش کا تجزیہ۔

قیمت صرف ۔ ۲ نئے پیسے

امریکہ کا صدارتی نظام

— نعیم صدیقی کی تازہ تحقیقی پیش کش —

— امریکی صدارتی نظام کا بے لاگ تنقیدی جائزہ

— اس کے حسن و قبح کا تفصیلی مطالعہ

— قانون اور سیاسیات کے طلباء اور ماہرین کے لیے خصوصی افادیت کی حامل کتاب

قیمت صرف دو روپے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، شاہ عالم مارکیٹ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۶۱	جنوری ۱۹۶۴ء	عدد ۴

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵-اے ذیلدار پارک - اچھرہ، لاہور

چندہ سالانہ: سات روپے —— فی پرچہ: ۷۵ پیسے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

حکومت و فرمانروائی کی کئی قسمیں ہیں، اس کی سب سے اعلیٰ وارفع قسم وہ ہے جسے قرآن مجید نے خلافت سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی وہ اجتماعی ہیئت جس کا واحد نصب العین اُن مقاصد کی تکمیل ہے جو انبیاء علیہم السلام لے کر دنیا میں تشریف لائے اور جنہیں ختم الرسل محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے کمال کے ساتھ عملی زندگی میں نافذ کر کے نوعِ بشری کے لیے قیامت تک ایک نمونہ فراہم کر دیا۔ یہ خلافت ایک ایسا نظمِ اجتماعی ہے جس کے منشا، مقصد اور نوعیت کو علمِ سیاست کی کوئی قدیم و جدید اصطلاح کما حقہٗ بیان کرنے سے قاصر ہے۔ یہ حکومت و فرمانروائی نہیں بلکہ خدمت اور چاکری ہے، یہ کوئی قوتِ قاہرہ نہیں، بلکہ نیکی اور بھلائی کی طاقت ہے، یہ قوم، ملک اور اُس کے خزانوں پر کوئی غیر مسئول اقتدار نہیں، بلکہ امانت کا ایک ایسا بارِ گراں ہے جو خدا کا کوئی اطاعت گزار بندہ بڑے خوف کے ساتھ اٹھانے پر آمادہ ہوتا ہے۔ اپنی کبریائی کے ٹھاٹھ قائم کرنے کے لیے اس کی آرزو اور تمنا نہیں کی جاتی۔ یہ بوجھ جب کسی شخص پر اُس کی اہلیت کی وجہ سے لاد دیا جاتا ہے تو وہ قوت کے اس سرچشمہ کو اُن بھلائیوں کو فروغ دینے کے لیے استعمال کرتا ہے جنہیں اسلام پروان چڑھانا چاہتا ہے اور اُن منکرات کے استیصال کے لیے اس سے مدد لیتا ہے جنہیں اسلام اس دنیا سے نیست و نابود کرنے کا آرزومند ہے۔

جن مقدس ہستیوں نے اس بار کو پورے شعور اور احساس ذمہ داری کے ساتھ اٹھایا، انہوں نے اپنے ذاتی آرام و آسائش کو بالکل تیاگ دیا۔ اس کی ذمہ داریوں کے تصور سے وہ کانپ جایا کرتے تھے اور اپنے خالق اور مالک کے حضور میں بڑے سوز کے ساتھ اس قسم کی دعائیں کیا کرتے تھے۔

اَللّٰھُمَّ کَبُرَتْ سِنِّیْ، وَ رَقَّ عَظْمِیْ وَ   بارالہا! مجھ پر بڑھاپا طاری ہو گیا ہے میری ہڈیاں

ضعفت قوتی وانتشرت رعیتی فاقبضنی الیک غیر عاجز ولا ملوم۔

میری قوت جواب دینے لگی ہے، پٹھے لگ گئیں۔ میری رعایا بہت پھیل گئی ہے، بس اب تو مجھے اپنے پاس اس حال میں بلالے کہ نہ میں نااہل قرار پاؤں اور نہ سزاوار ملامت۔

حکومت کی دوسری قسم مغربی طرز کی جمہوریت ہے۔ اس نظام کے چلانے والے حکومت کو خدا کی کوئی مقدس امانت نہیں سمجھتے لیکن اسے بہر حال قوم کی امانت ضرور خیال کرتے ہیں اور دورِ اقتدار میں اس امر کے لیے پوری دیانت داری سے کوشاں رہتے ہیں کہ وہ قوم کی امنگوں اور آرزوؤں کو بروئے کار لائیں۔ ان کے اندر گو خلافت کا بار اٹھانے والوں کی سی بے لوثی تو پیدا نہیں ہو سکتی لیکن چونکہ وہ اپنی قوم کے سامنے اپنی پبلک لائف کی ہر حرکت کے ذمہ دار ہوتے ہیں اس لیے وہ اقتدار کے نشے میں بدمست ہو کر من مانی کارروائیاں کرنے سے ہمیشہ احتراز کرتے ہیں۔

حکومت کی ایک قسم وہ ہے جس میں حاکم یونانی دیوتاؤں کا سا کردار ادا کرتے ہیں۔ وہ رعایا کے دکھ درد سے بالکل الگ ہو کر محلات کے اندر عیش و تنعّم کی زندگی گزارتے ہیں۔ رعایا مرے یا جیئے انہیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ اُن کی عیاشیوں کے لیے اگر ٹیکس کی مطلوبہ رقم فراہم ہوتی رہے تو پھر وہ اپنی رعایا پر ہمیشہ خوش رہتے ہیں۔ وہ اپنا فرض صرف اسی قدر سمجھتے ہیں کہ قوم کو غیر ملکی حملہ آوروں سے بچایا جائے یا اگر ملک کے اندر بدامنی پھیل گئی ہے تو اس کا قلع قمع کیا جائے۔ ان دو فرائض کے علاوہ اُن کا کوئی تیسرا فرض نہیں ہوتا۔ ملک کے اندر نظامِ تعلیم کس نہج پر مرتب کیا جائے، معاشرتی زندگی کو کس سانچے میں ڈھالا جائے اور اسی طرح کے بیشمار مسائل سے انہیں قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ یہ طرزِ حکومت اگرچہ انسانوں کے لیے کسی لحاظ سے بھی مفید ثابت نہیں ہوا لیکن اس کا بہر حال ایک فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ حاکم اگر معروفات کی توسیع و ترقی کے لیے کوئی التزام نہیں کرتا تو وہ منکرات کے پھیلانے

کے لیے بھی کوئی منصوبے نہیں بناتا۔ جو برائیاں اقتدار سے وابستہ ہوتی ہیں وہ محلات کی چار دیواری تک محدود رہتی ہیں اور عام آبادی میں اثر و نفوذ نہیں کرنے پاتیں۔ اس کے علاوہ عوام کو بھی اپنی تعلیمی اور اپنی معاشرتی زندگی کی تشکیل و تنظیم میں کافی حد تک آزادی ہوتی ہے۔ وہ اپنے لیے جس قسم کا نظامِ تعلیم چاہیں مرتب کر سکتے ہیں۔ وہ اپنی عائلی زندگی، اپنے مذہبی معتقدات اور دینی تصورات کے مطابق بسر کرنے میں آزاد ہوتے ہیں اور برسرِ اقتدار طبقے کے ذاتی رجحانات اُن کی راہ میں حائل نہیں ہوتے۔

حکومت کی سب سے خوفناک قسم وہ ہے جس کا خمیر شہنشاہیت اور استعماریت سے اٹھایا گیا ہے۔ یہ حکومت کسی ایک فرد، خاندان یا کسی استعمار پسند قوم کی کبریائی قائم کرنے کے لیے معرضِ وجود میں آتی ہے۔ اس حکومت کا مقصدِ وجود بندگانِ خدا کی خدمت کرنا نہیں ہوتا بلکہ انہیں تباہ و برباد کرنا ہوتا ہے۔ جبر و استبداد، سفاکی اور زیردست آزاری اس حکومت کے رہنما اصول ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے نہایت گھٹیا اور ذلیل قسم کے ہتھکنڈے استعمال کیے جاتے ہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے اس امر کی کوشش کی جاتی ہے کہ قوم کے اندر سے ایسے کمزور سیرت و کردار رکھنے والے لوگوں کو تلاش کیا جائے جو محض اقتدار کی رضا جوئی کے لیے اپنے بھائی بندوں کا گلا گھونٹنے سے بھی دریغ نہ کریں۔ اس طرح قوم کی گردن پر ایک ایسا طبقہ مسلط ہو جاتا ہے جو اس کے مفادات کا دشمن اور بدخواہ اور اس کے خون کے پیاسوں کا دل و جان سے ہمدرد اور خیر خواہ ہوتا ہے۔ پھر اس طبقہ کی پوری قوت و طاقت کے ساتھ پشت پناہی کی جاتی ہے تاکہ اس کے ناپاک عزائم میں کوئی اضمحلال نہ پیدا ہونے پائے۔

دوسرے اس امر کا بھی پورا پورا اہتمام کیا جاتا ہے کہ قوم سیاسی اعتبار سے بالکل مفلوج رہے۔ چنانچہ جب بھی اس کے اندر سیاسی بیداری کی کوئی لہر ابھرتی ہے تو اسے پوری قوت کے ساتھ دبا دیا جاتا ہے۔ اُسے ہمیشہ اس بات کی تلقین کی جاتی ہے کہ وہ جانوروں کی طرح کسی شعور و احساس کے بغیر مسلسل کام کرتی رہے، عالمِ بالا سے جو احکام صادر ہوں انہیں بلا چون و چرا بجا لاتی رہے اور برسرِ اقتدار

طبقہ کے کسی قول یا عمل پر کوئی حرف گیری نہ کرے اور اُسے اس امر کی پوری پوری اجازت دے کہ وہ اپنی منشا اور مرضی کے مطابق جس طرح چاہے جونک کی طرح اس کا لہو چوستا رہے۔

یہ مقاصد جتنے ناپاک ہیں اتنے ہی ناپاک ذرائع سے ان کا حصول ممکن ہے۔ چنانچہ آپ جب بھی استعمار پسندوں کی ذہنیت کا تجزیہ کریں گے تو آپ کو اُس کے پیچھے بجز تکبّر، نخوت، حرص و ہوا کی پرستش، بے ضمیری، بے حسی اور مردم آزاری کے اور کوئی چیز نہ ملے گی۔ تاریخِ انسانی میں اس بیمار ذہنیت کے بیشمار نمونے ملتے ہیں۔ ہم یہاں اُن کی صرف چند جھلکیاں دکھاتے ہیں جن سے اس ذہنیت کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

۱۹۱۹ء میں مارشل لا کے نفاذ کے فوراً بعد جلیانوالہ باغ کا حادثہ پیش آیا۔ یہ حادثہ اتنا دردانگیز تھا کہ اس پر ہندوستان کے طول و عرض میں صفِ ماتم بچھ گئی اور پوری انسانیت کا ضمیر تلملا اٹھا لیکن جن لوگوں کو اقتدار کے نشے نے بدمست کر رکھا تھا۔ اُن کے دل کے تاروں میں کوئی ارتعاش پیدا نہ ہوا۔ اُن میں سے کسی کی آنکھ پُرنم نہ ہوئی اور کسی کے سینے میں ندامت کا کوئی احساس بیدار نہ ہوا۔ انہوں نے بے گناہ افراد کی موت کو اتنی بھی اہمیت نہ دی جتنی کہ کوئی شخص جانوروں کی موت کو دیتا ہے! اس دلفگار حادثہ کے سب سے بڑے ہیرو ڈائر نے ہنٹر کمیشن کے سامنے جو بیان دیا ہے اُس سے اس سفاکانہ ذہنیت کی پوری پوری غمازی ہوتی ہے۔ یہ بیان بڑا ہی اہم اور عبرت انگیز ہے۔ ہم یہاں اُس کے چند اقتباسات نقل کرتے ہیں۔

"ہنٹر: جب فوج شہر میں گشت کر رہی تھی تو ہجوم کس حالت میں تھا؟

ڈائر: یہ لوگ بڑے شوخ اور گستاخ نظر آتے تھے۔

ہنٹر: تمہارے پاس اُن کے شوخ اور گستاخ ہونے کا کیا ثبوت ہے؟

ڈائر: وہ ہندو مسلم اتحاد کے نعرے لگا رہے تھے۔ میں نے انہیں منتشر ہو جانے کا حکم دیا مگر انہوں نے پس و پیش کی۔ میرے میجر نے مجھے بتایا کہ جب ہم گشت کرتے ہوتے ادھر سے

گذرے تو کچھ ناہنجار ہمیں دیکھ کر زمین پر تھوکتے تھے۔"

آپ مزاج کی برہمی ملاحظہ فرمائیں کہ محض چند انسانوں کے زمین پر تھوک دینے سے انتقام کی آگ بھڑک اٹھتی ہے اور یہ آگ معصوم عوام کے خون سے ہولی کھیلنے کے بعد بھی فرو نہیں ہونے پاتی۔ یہ غالباً اس برہمی کا اثر تھا کہ اس شخص نے جلیانوالہ باغ میں پہنچتے ہی لوگوں کو گولی کا نشانہ بنا دیا۔ اس ضمن میں اس ظالم کے بیانات بڑے ہی روح فرسا ہیں:

"ہنٹر: کیا تم نے اس موقع پر لوگوں کو کوئی تشدد پسندانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے دیکھا؟

ڈائر: نہیں، میں نے ایسی کوئی چیز نہیں دیکھی۔

ہنٹر: تم نے جلیانوالہ باغ میں داخل ہوتے ہی کیا اقدام کیا؟

ڈائر: میں نے گولی چلا دی۔

ہنٹر: کیا فوراً؟

ڈائر: ہاں فوراً؟ اس امر کا فیصلہ میں نے تیس سکنڈ کے وقفے کے اندر کر لیا۔"

ڈائر کے اس جواب کا غور سے مطالعہ کیجیے اور دیکھیے کہ بگڑے ہوئے لوگوں کے ہاتھ میں جب عنانِ اقتدار آجاتی ہے تو وہ لوگوں کی جانوں کے بارے میں کتنی بے پروائی سے فیصلے کرتے ہیں۔ یہاں نہتے اور پُرامن عوام پر گولی چلانے کا معاملہ درپیش تھا لیکن اس فیصلے میں صاحب بہادر کو تیس سکنڈ سے زیادہ کا وقفہ نہیں لگا۔ اس جواب میں برسرِ اقتدار طبقے کی انانیت، خود پسندی، رعونت اور بے حسی اور مردم آزاری پوری طرح نمایاں ہے۔ اسی موضوع کے متعلق استفسار کرتے ہوئے ہنٹر کہتا ہے:

"یہ عین ممکن ہے کہ ہجوم میں بہت سے افراد ایسے بھی ہوں جنہیں تمہارے احکام کا علم نہ ہو۔ ان حالات میں کیا تمہارے لیے یہ مناسب نہ تھا کہ تم گولی چلانے سے پیشتر ایک مرتبہ لوگوں کو منتشر ہو جانے کی ہدایت کرتے؟

ڈائر: نہیں، مجھے کبھی اس امر کا احساس نہیں ہوا۔ میں نے فقط یہ دیکھا کہ میرے احکام کی تعمیل نہیں کی گئی۔ مارشل لا کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ اس بنا پر میں نے اپنا فرض منصبی

سمجھا کہ گولی کے ذریعہ انہیں منتشر کر دوں"۔

یہ ہے استعمار پسندانہ ذہنیت کا صحیح عکس۔ جب بھی اس قسم کی بیمار ذہنیت والے لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار کی باگیں آئی ہیں تو وہ یہ نہیں دیکھتے کہ اُن کی کسی حرکت سے مخلوقِ خدا کا کتنا بھاری نقصان ہوتا ہے۔ انہیں ہمیشہ اس بات کی فکر دامنگیر رہتی ہے کہ کوئی شخص بھی ان کے کسی حکم سے سرتابی کرنے کی جسارت نہ کرے۔ وہ جس قسم کے ظالمانہ احکام صادر کرتے رہیں لوگ بلا ادنیٰ تامّل انہیں بجا لاتے رہیں۔ اس قسم کے لوگوں کا ظرف بڑا چھوٹا ہوتا ہے۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور معمولی معمولی اختلافات پر نہایت ہی گھناؤنے مظالم کا ارتکاب کرنے سے نہیں چوکتے۔ کسی معاملے کے حسن و قبح پر سنجیدگی سے غور کرنا، صبر و تحمّل سے حالات کا مطالعہ کرنا، مشاہدہ کر کے کسی نتیجہ پر پہنچنا اور پھر احتیاط کے ساتھ کوئی فیصلہ کرنا اُن کے بس کا کام نہیں ہوتا۔ ان کی اشتعال گیر طبیعت ہمیشہ اس امر کی خواہاں رہتی ہے کہ اُسے بھڑکنے کا کوئی ادنیٰ سا موقع ہاتھ آئے تاکہ وہ قہرمانیوں کا مظاہرہ کر کے اپنے نفس کی تسکین کا سامان فراہم کر سکے۔

پھر اس ہوس پرستانہ ذہنیت کا یہ بھی ایک لازمی خاصہ ہے کہ اُسے اپنی صحیح حدود کا احساس نہیں رہتا جس کی وجہ سے اُس کے اندر انا و لاغیری کا غلط جذبہ پرورش پاتا ہے۔ چنانچہ اُس کے اندر آمریت اور خود پسندی کے نہایت خطرناک رجحانات اُبھرنے لگتے ہیں۔ ایسے افراد اپنے ہر فیصلے کو قطعی حتمی اور ہر خطا سے پاک اور منزّہ سمجھنے لگتے ہیں۔ غیر مسئول اقتدار کی چاٹ آہستہ آہستہ اُن کے اندر اس باطل خیال کی آبیاری کرتی ہے کہ اُن کا ہر حکم عدل و انصاف کے تقاضوں کے عین مطابق ہے اور اس سے ہٹ کر جو دوسری صورت بھی اختیار کی جائے وہ لازمی طور پر حماقت اور بے وقوفی ہے۔

آپ ڈائر کے بیان میں اسی مجرمانہ ذہنیت کی پوری جھلک دیکھ سکتے ہیں۔

ہنٹر ڈائر سے سوال کرتے ہوئے کہتا ہے کہ کیا تم نے گولی چلاتے وقت اپنے ساتھی پولیس افسر سے بھی مشورہ کرنا مناسب نہ سمجھا؟

ڈائر: ہاں میں نے اس معاملہ میں اُس سے کسی قسم کا کوئی مشورہ نہیں لیا۔ میں اپنے آپ کو ذہنی

طور پر تیار کرکے گھر سے روانہ ہوا تھا کہ اگر میرے احکام کی سرِ مُو بھی سرتابی کی گئی تو میں فوراً گولیوں کی بوچھاڑ کردونگا۔

ہنٹر: گولی چلانے سے تمہارا مقصد کیا ہجوم کو منتشر کرنا ہی تھا؟

ڈائر: ہاں میرے پیش نظر صرف یہی مقصد تھا۔

ہنٹر: کیا ہجوم اُسی وقت منتشر ہونے لگا تھا جس وقت تم نے گولی چلائی؟

ڈائر: ہاں ہجوم فوری طور پر درہم برہم ہونا شروع ہوگیا تھا۔

ہنٹر: اگر ہجوم میں پہلی بوچھاڑ پر ہی بھاگڑ پیدا ہوگئی تھی تو تم نے اس سلسلہ کو مزید کیوں جاری رکھا۔

ڈائر: میں اسے اپنا بنیادی فرض سمجھتا تھا کہ جب تک وہاں ایک متنفس بھی موجود ہے میں برابر یلغار کرتا رہوں۔ اگر یہ حملہ ذرا کمزور ہوتا تو اس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوسکتا تھا۔

ہنٹر: کیا تمہیں اس امر کا احساس نہیں کہ اگر تم گولی چلائے بغیر بھی ہجوم کو منتشر ہوجانے کا حکم صادر کرتے تو وہ فوراً تعمیلِ احکام کردیتا؟

ڈائر: ہاں میرے نزدیک یہ عین ممکن تھا۔ یہ بات قرینِ قیاس ہے کہ ہجوم گولی چلائے بغیر ہی منتشر ہوجاتا۔

ہنٹر: پھر تم نے یہ دوسرا طریقہ کیوں اختیار نہ کیا؟

ڈائر: اس طریقے میں قباحت یہ تھی کہ لوگ کچھ وقت کے لیے تو منتشر ہوجاتے لیکن پھر واپس آکر میرے اس رویہ پر خندہ زن ہوتے۔ مَیں نے ان کا ہدفِ استہزا بننا پسند نہ کیا۔"

اس جواب کا مطالعہ کرتے وقت یہ امر بھی ذہن نشین رہے کہ مارشل لا کے نفاذ سے پہلے جب لوگوں کو اس قانون کے مضمرات کا کوئی شعور نہ تھا، یہ شخص ایک امن پسند ہجوم پر اچانک جاکر گولی چلا دیتا ہے اور پھر اسے اقتدار کا سوال بنا کر لوگوں کو نہ صرف ہر قسم کے مظالم کا تختۂ مشق بناتا ہے بلکہ کمیشن کے سامنے

بڑے فخر اور تکبّر کے ساتھ کہتا ہے کہ میں نے جو کچھ کیا ہے وہی بالکل صحیح اور درست ہے اور اس فعل میں مجھے کوئی قباحت نظر نہیں آئی ۔ آپ اس کی خود پسندی کا مندرجہ ذیل عبارت سے اندازہ لگا سکتے ہیں ۔ کمیشن کا ایک ممتاز رکن سیتل واد اسی موضوع (یعنی گولی چلانے کے علاوہ ہجوم کو منتشر کرنے کی کسی دوسری متبادل صورت) کے بارے میں سوال کرتے ہوئے کہتا ہے کہ کیا تم نے اس کے متعلق کچھ غور کرنا بھی پسند نہ کیا؟

ڈائر : میں تمہارے مدعا کو اچھی طرح پا نہیں سکا۔ لیکن میں اس قدر جانتا ہوں کہ میں نے جو کچھ کیا ہے صحیح کیا ہے ۔ اختیارات کی باگیں اس وقت میرے ہاتھ میں تھیں اور اس لیے میں نے جو کچھ سوچا وہی مبنی برحق تھا ۔ اس بنا پر مجھے کسی متبادل صورت پر غور کرنے کی سرے سے ضرورت نہ تھی ۔ جب کسی شخص کے سامنے صحیح چیز آجائے تو پھر اس کے علاوہ کسی دوسری چیز پر غور کرنا بالکل بے سود ہے ۔

آپ ڈائر کے اس بیان کو بار بار پڑھیئے اور دیکھیے کہ شیطنت جب اقتدار کا تخت سنبھالتی ہے تو اس میں کتنا غرور اور تکبر پیدا ہو جاتا ہے اور اس نخوت اور خود پسندی کے جراثیم کس حیرت انگیز سرعت کے ساتھ پرورش پاتے ہیں اور وہ لطیف احساسات سے کس طرح عاری ہو کر انسانوں کے ساتھ معاملہ کرتی ہے ۔ جو مسائل صرف تلقین و ترغیب کی مدد سے بڑی آسانی کے ساتھ حل کیے جا سکتے ہوں ان میں بھی انتہائی سختی کا رویہ اختیار کیا جاتا ہے تاکہ لوگوں کے حوصلے بالکل ٹوٹ جائیں اور وہ اپنی قومی امنگوں اور تمناؤں کے خود اپنے ہاتھ سے مدفن تیار کر کے ان پر مجاوروں کی طرح یادوں کے دیئے جلاتے میں مصروف رہیں اور اس طرح آنے والی نسلوں کو عزائم کی قوت اور حوصلوں کی بلندی عطا کرنے کی بجائے مایوسیوں اور ناکامیوں کی تصاویر فراہم کر دیں ۔ چنانچہ تاریخ اس امر پر شاہد ہے کہ جب بھی شیطان نے اقتدار کا تخت بچھایا ہے تو اس نے چوروں، ڈاکوؤں اور قاتلوں سے تو نرمی برتنا گوارا کیا ہے لیکن ان لوگوں کو کبھی معاف نہیں کیا جو اپنے ضمیر اور ایمان کو اس کے پاس رہن رکھنے پر آمادہ نہیں ہوتے ۔ اس نے ہمیشہ اس قسم کے "باغی" لوگوں کی اس بے دردی سے خبر لی ہے کہ پوری قوم دہشت زدہ

ہو کر بیٹھ گئی اور اقتدار نے پھر بالکل بے لگام ہو کر لوگوں کو اپنی ہوس کاریوں کا نشانہ بنایا۔

اس ضمن میں ذرا ڈائر کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں۔ یہ بے حس جنرل نہتے عوام کو کچلنے کے لیے اپنے ساتھ دو مشین گنیں اور کچھ بکتر بند گاڑیاں بھی لے گیا تھا لیکن اتفاق سے یہ توپیں راستہ تنگ ہونے کی وجہ سے ہجوم تک لے جائی نہ جا سکیں۔ اس پر مسٹر سیتلواد اس سے استفسار کرتا ہے:

"فرض کیجیے کہ راستہ اتنا کشادہ ہوتا کہ یہ مشین گنیں اور بکتر بند گاڑیاں اُس میں گزر سکتیں تو کیا تم ان کے دہانے کھولنے پر بھی آمادہ ہو جاتے؟

ڈائر: ہاں، کیوں نہیں!

سیتلواد: اس صورت میں کیا اموات زیادہ نہ ہوتیں؟

ڈائر: ہاں، یقیناً ایسا ہی ہوتا۔

سیتلواد: کیا ان توپوں کے استعمال کرنے میں بھی تم اتنی ہی عجلت سے کام لیتے جتنی عجلت کے ساتھ تم نے گولی چلانے کا حکم دیا ہے؟

ڈائر: ہاں میں اسی طرح کرتا۔

سیتلواد۔ تمہاری رپورٹ دیکھ کر اس امر کا بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ تمہارے اس تشدد پسندانہ طرزِ عمل کے پیچھے عوام کو خوفزدہ کرنے کا جذبہ کارفرما تھا؟

ڈائر: آپ اس جذبہ کو جو نام دینا چاہیں اس معاملے میں آزاد ہیں۔ میں بہرحال لوگوں کو سزا دینے کا عزم بالجزم رکھتا تھا۔ میں فوجی نقطۂ نظر سے گولیوں کی اس بوچھاڑ سے وسیع تر اثرات مرتب کرنا چاہتا تھا۔

سیتلواد: یعنی تم نہ صرف امرتسر میں بلکہ سارے پنجاب میں خوف و ہراس پیدا کرنا چاہتے تھے؟

ڈائر: ہاں سارا پنجاب ہی میرے پیشِ نظر تھا۔ میں اُن کے حوصلوں کو مضمحل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا، باغیوں کے بڑھے ہوئے حوصلے اسی سلوک کے مستحق تھے۔

سیتل واد: کیا یہ اقدام کرتے ہوئے تم یہ سمجھ رہے تھے کہ عوام کو وحشت زدہ کرنے سے
تم برطانوی راج کو بچانے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔

ڈائر: نہیں، برطانوی راج تو ایک بڑی باجبروت قوت ہے۔ اسے کسی طرح کوئی خطرہ
لاحق نہیں ہو سکتا۔ مَیں تو عوام کے جان و مال کی حفاظت کے لیے کوشاں تھا۔

سیتل واد: کیا تمہیں کبھی اس معاملے میں اس امر کا بھی احساس ہؤا ہے کہ اس قسم کے
اقدام کرنے سے تم برطانوی راج کو فائدے کی بجائے نقصان پہنچا رہے ہو۔

ڈائر: نہیں میں اسے بہت بڑی خدمت خیال کرتا ہوں۔ میرے اس رویہ سے لوگوں
کو تنبیہ ہو جائے گی اور وہ کبھی شرارت پسندی پر آمادہ نہ ہونگے۔

ہنٹر: جنرل ڈائر! کیا تمہیں اس بات کا احساس نہیں کہ خواہ تمہیں مارشل لا کے تحت
ہی انتظام و انصرام کرنا پڑے، تمہیں کوئی ایسا قدم نہ اٹھانا چاہیے جس سے عوام
کے اندر انتظامیہ کے متعلق مستقل طور پر بددلی پھیلنے کا خدشہ ہو۔

ڈائر: ہاں یہ بات کسی حد تک درست ہے لیکن آخر ہمیں عوام کے لیے سامانِ عبرت
بھی تو مہیا کرنا چاہیے۔

آپ اگر استعماریت کے ظالمانہ ہتھکنڈوں کا دقتِ نظر سے مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس سامانِ عبرت کی فراہمی ہی سے استعمار کچھ دیر تک عوام کی گردنوں پر مسلط رہنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ اس ناپاک مقصد کے حصول کے لیے معصوم لوگوں کو خاک و خون میں تڑپانے پر ہی اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ ضمیر و احساس کے ان سارے سوتوں کو بند کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جن سے اختلاف کی لہریں پیدا ہونے کا کوئی امکان بھی موجود ہو۔

اس مقصد کے لیے سب سے زبردست حملہ معصوم انسانوں کے ضمیر اور اُن کی عزتِ نفس پر کیا جاتا ہے تاکہ وہ بالکل مضمحل ہو کر بیٹھ جائیں۔ جنرل ڈائر نے اس سلسلے میں جو مختلف حربے استعمال

کیے ان میں پہلا حربہ یہ تھا کہ مجرم و معصوم کی تمیز کے بغیر جو کوئی ہاتھ لگتا اُسے بالکل برہنہ کر کے سر بازار کوڑے لگائے جاتے۔ اس کے علاوہ اس ظالم نے ایک خاص محلے کو، جس میں اُس کے قول کے مطابق ایک انگریز عورت کی توہین کی گئی تھی، ایک چبوترہ بنوایا اور امرتسر کے چند شرفاء کو جنہوں نے پولیس کی ظالمانہ کارروائیوں میں اس کا شریک بننے سے انکار کر دیا تھا، اس پر کھڑا کر کے اُن کی بڑے وحشتناک طریق سے پٹائی کروائی تاکہ وہ دوسرے "گستاخ لوگوں" کے لیے سامانِ عبرت بن سکیں۔

پھر اسی محلہ کے متعلق یہ حکم بھی دیا گیا کہ جس شخص کو بھی اس طرف سے گزرنا ہو، وہ سیدھا چل کر نہیں بلکہ رینگ کر اس فاصلے کو طے کرے۔ اس کے ساتھ ساتھ پورے شہر میں اس امر کا اعلان کیا گیا کہ جہاں کہیں بھی کوئی سفید فام نظر آئے اُسے فوجی آداب کے تحت سلام کر کے اپنی نیازمندی کا مظاہرہ کیا جائے۔ اس ضمن میں یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ ان احکام سے عوام کو پوری طرح آگاہ کرنے سے پیشتر ہی گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور پولیس اور فوج نے لوگوں کے دل و دماغ پر حکامِ وقت کی ہیبت بٹھلانے کے لیے اُن کی بے تحاشا مرمت کی۔

ممکن ہے ایک سطح بین انسان ان سزاؤں کو اتنا لرزہ خیز نہ سمجھے جتنا کہ پھانسی یا قتل کو عام طور پر سمجھا جاتا ہے لیکن وہ لوگ جو انسانی نفسیات سے معمولی واقفیت بھی رکھتے ہیں وہ اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس قسم کی سزاؤں سے انسان کی عزتِ نفس کو ناقابلِ تلافی صدمہ پہنچتا ہے، اِن سے اس کی خودی کی موت واقع ہوتی اور ان کی اذیت جھیلنے کے بعد وہ بسا اوقات انسانیت کے سارے قیمتی احساسات اور جذبات کھو بیٹھتا ہے اور آب و گِل کا ایک متحرک پیکر بن جاتا ہے۔ آپ اگر جرم و سزا کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ دنیا کے غیرتمند انسانوں کو جب ظلم و استبداد نے تختۂ دار پر لٹکایا تو انہوں نے بڑی جرأت مندی کے ساتھ جان کی بازی لگا دی لیکن جب اُن کی عزتِ نفس کو مجروح کرنے کے لیے کوئی قدم اٹھایا گیا تو وہ اتنے دل برداشتہ ہوئے کہ دماغی توازن تک کھو بیٹھے۔

ایک شریف انسان کے لیے اپنی زندگی سے کہیں زیادہ اپنی عزت عزیز ہوتی ہے۔ وہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا سکتا ہے لیکن کسی ایسے وار کو برداشت نہیں کر سکتا جس میں اُس کے نفس کی تذلیل مقصود ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جتنی کوئی حکومت اخلاقی اعتبار سے کمزور ہوتی ہے اتنی ہی وہ شرفاء کی تذلیل کا سامان فراہم کرتی ہے تاکہ یہ لوگ خوفزدہ ہو کر لب کشائی کی جرأت نہ کریں۔ برطانوی ہند کی پولیس آزادی کے علمبرداروں کے ساتھ جس قسم کا انسانیت سوز سلوک کرتی رہی ہے اس کے تصور سے اب بھی جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ قید و بند کے مصائب تو اُن مظالم کے مقابلے میں کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتے جو عزتِ نفس کو پامال اور برباد کرنے کے لیے غریب اور کمزور کارکنوں پر توڑے گئے اور یہ سب کچھ ایک لگے بندھے منصوبے کے تحت سرانجام دیا گیا۔ کسی قوم کے ضمیر کو مُردہ کرنے، اس کی امنگوں اور آرزوؤں کو برباد کرنے، اُس کے عزم و ارادہ کو مضمحل کرنے اور اس کے اندر جرأت مندی اور حُریت کے جذبات کو کچلنے کے لیے دار و رسن کی سزا کبھی بھی مؤثر نہیں ہوتی۔ اس سے ذوقِ جنوں بڑھتا ہے۔ یہ ناپاک مقصد خودی کی موت سے ہی حاصل کیے جاتے ہیں۔ اس لیے استعمار اور شہنشاہیت نے ہمیشہ اس کی موت کا سامان کیا۔ استبداد کی ان دونوں قوتوں کو اس امر کا شدید احساس رہتا ہے کہ اگر عقل و شعور کو مفلوج نہ کیا جائے تو عوام ذہنی غلامی قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتے اور وہ حکمرانوں کے طرزِ فکر سے ہٹ کر سوچنے کی جسارت کر بیٹھتے ہیں۔ اسی طرح اگر ان کے ضمیر میں زندگی کی کوئی رمق موجود ہو تو وہ ظلم و استبداد کا نہ تو آلۂ کار بننے پر رضامند ہوتے ہیں اور نہ اُسے خاموشی سے برداشت کر سکتے ہیں۔ ان کی زبانوں سے کبھی کبھی حرفِ شکایت نکل ہی جاتا ہے۔ ان کے اندر جب تک عزتِ نفس کا کوئی احساس باقی ہے تو ان کے لیے یہ بات ناممکن ہے کہ وہ اپنی اور اپنے بھائی بندوں کی تذلیل پر مسرت و شادمانی کا اظہار کریں اور ظالموں کا ہاتھ روکنے، یا زبان سے اُن کی ریشہ دوانیوں کی مذمت کرنے کی بجائے دل و جان سے اُن کی تائید کریں۔ اس بنا پر استبداد اس وقت تک کبھی بھی مطمئن نہیں ہوتا جب تک کہ اُسے اس بات کا پوری طرح یقین نہ ہو جائے کہ ملک کی بہت بڑی اکثریت کو یا تو شعور کی پستی نے انسانوں کے زمرہ سے نکال کر حیوانوں کی صف میں کھڑا کر دیا ہے، یا زینتِ حیاتِ دنیا کی چمک

نے اس کی نظروں کو اس حدتک خیرہ کر دیا ہے کہ وہ ان لرزہ خیز مظالم کو دیکھنے سے قاصر ہیں جو ہر وقت اُن کے سامنے ہوتے رہتے ہیں یا اس کے ضمیر اس حدتک مُردہ ہو چکے ہوں کہ بڑے سے بڑا ظلم اور شدید سے شدید ناانصافی بھی اس کے اندر نفرت وحقارت کی کوئی تحریک پیدا نہیں کر سکتی۔ اس قسم کے بے شعور اور بے ضمیر پیکر خاکی استبداد کا اول روز ہی سے بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ وہ اپنی سوسائٹی میں خواہ کتنے ہی بے وزن ہوں اور اُن کی رائے خواہ کتنی ہی احمقانہ ہو لیکن ظالم حکمرانوں کے لیے اُن کی حیثیت گوہر ہائے نایاب کی سی ہوتی ہے۔ چنانچہ دیکھیے کہ ڈائر اپنے بیان میں اس قسم کے لوگوں کی بے حد مدح سرائی کرتا ہے۔ جلیانوالہ باغ کے حادثہ نے ملک کے طول وعرض میں انگریزی سامراج کے خلاف نفرت کی ایک خوفناک لہر دوڑا دی اور پوری قوم نے اس پر شدید غیظ وغضب کا اظہار کیا۔ یہ حادثہ اتنا المناک تھا کہ خود انصاف پسند انگریزوں کا ضمیر تڑپ اٹھا اور حکومت کو اس کی تحقیق کے لیے کمیشن مقرر کرنا پڑا۔ لیکن ڈائر کو اس سارے احتجاج میں سے کوئی چیز نظر نہ آئی اور اس نے بڑی ڈھٹائی کے ساتھ کمیشن کے سامنے کہا:

> "میرے اس فوری اور جرأت مندانہ اقدام کو ہندوستانی رؤسا نے سراہا اور انہوں نے میرا شکریہ ادا کیا کہ میں نے حالات کو بدتر صورت اختیار کرنے سے بچایا ہے۔"

گذشتہ صفحات میں ہم نے صرف جنرل ڈائر کی تصریحات نقل کی ہیں۔ لیکن یہ ذہن نشین رہے کہ ڈائر کوئی منفرد شخصیت نہ تھی جس نے محض وقتی جوش میں آکر یہ سارے مظالم ڈھائے۔ ڈائر ایک جابرانہ نظامِ حکومت کا نمائندہ ہے اور اس کے پورے طرزِ عمل میں درحقیقت اس جابرانہ نظام کی روح کارفرما ہے جس کا وہ محافظ اور پاسبان ہے۔ دنیا میں جب کبھی بھی اقتدار کے تخت پر ایسے لوگ متمکن ہوتے جو اس تمکن کے لیے کوئی اخلاقی جواز نہ رکھتے تھے تو انہوں نے ہمیشہ اس ظالم جرنیل کا سا رویہ اختیار کیا۔ ڈائر دراصل ایک ذہنیت ہے جو ہمیں ماضی اور حال کے بےشمار حکمرانوں کے اندر جلوہ گر نظر آتی ہے۔ اس ذہنیت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ حکومت اور فرمانروائی کے

لیے قریب قریب وہی ہتھکنڈے استعمال کرتی ہے جو ڈائر نے کیے تھے۔ ان ہتھکنڈوں کو استعمال کیے بغیر وہ اپنے ناپاک مقاصد کو کبھی حاصل نہیں کر سکتی۔

آئیے اب ہم یہ دیکھیں کہ ڈائرانہ ذہنیت اس قسم کے جابرانہ اقدام کیوں کرتی ہے اس کی سب سے پہلی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ بھی طاقت کے زور سے اقتدار کے تخت پر قابض ہوتے ہیں ان کے دل میں یہ چُھپتا ہوا احساس ہمیشہ موجود رہتا ہے کہ انہوں نے انسانوں کے ساتھ ایک بڑا شرمناک کھیل کھیلا ہے۔ یہ خلش انہیں احساس کہتری کے ہولناک مرض میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اس لیے وہ ہمیشہ اپنی غیر معمولی طاقت کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔ آپ اگر ان لوگوں کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ یہ لوگ ہمیشہ سستی شہرت حاصل کرنے کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور پولیس اور فوج کے ذریعے لوگوں پر اپنی ہیبت طاری کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہیں ہمیشہ یہ فکر دامنگیر رہتی ہے کہ اخبارات میں نمایاں تصاویر کے ساتھ ان کے ہر قول اور فعل کی تشہیر ہو، ملکی پریس اُن کے غیر معمولی تدبر اور ذہانت کا ڈھنڈورا پیٹے۔ اُن کی خدمت میں لمبے چوڑے سپاسنامے پیش کیے جائیں اور قوم اُن کے ناجائز تسلط اور اُن کی ریشہ دوانیوں کو یکسر نظر انداز کر کے انہیں نجات دہندہ تسلیم کرنے لگے۔ یہ حضرات لوگوں کو ہر آن یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی یہ دراز دستیاں اور ستمرانیاں عوام کی بہتری اور بھلائی کے لیے ناگزیر ہیں۔ اس لیے وہ بالکل بادلِ ناخواستہ ایسا کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں اور وہ یہ سب کچھ قوم کی فلاح و بہبود کے لیے کر رہے ہیں۔ اس میں اُن کی کوئی ذاتی غرض کارفرما نہیں۔ اس قسم کی فریب کاریوں کے لیے ان ظالموں نے عجیب و غریب قسم کے فلسفے گھڑ رکھے ہیں اور ان پر پردہ ڈالنے کے لیے وہ بسا اوقات بڑی ہی دلفریب اصطلاحات کا سہارا لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر انگریزی استعمار کے ظلم و ستم کو اس قوم کے دانشوروں اور شعراء نے "سفید فام کی خدماتِ جلیلہ" سے تعبیر کیا ہے۔ وہ انسانیت کو اس دھوکہ میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں کہ گوری قوم نے کالے لوگوں کی آزادی سلب کر کے اور اقتدار کی باگیں سنبھال کر اپنے اوپر ایک ناقابلِ

برداشت بوجھ لادا ہے اور اس وجہ سے ملامت کی نہیں بلکہ شکریہ کی مستحق ہے۔ انگلستان کے شاعر رڈیارڈ کپلنگ کی مشہور نظم "سفید فام کا بار" اس ذہنیت کی پوری طرح غمازی کرتی ہے۔ یہاں اس کے چند اشعار کا ترجمہ دیا جاتا ہے:

"تم سفید فام کی ذمہ داریوں کو اٹھا دو
اپنی بہترین نسل کو اس کام کے لیے آگے بڑھاؤ
جاؤ اور اپنے نوجوانوں کو
جلاوطنی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کرو
تاکہ وہ تمہارے غلاموں کی ضروریات کی نگہداشت کرسکیں۔"
بپھرے ہوتے اور منہ زور لوگوں پر تسلط قائم کریں
وہ لوگ جو نو گرفتار ہیں
خودسر اور ضدی ہیں
شیطنت نے جن کا ابھی پیچھا نہیں چھوڑا
اور بچپن نے جنہیں اپنے چنگل سے ابھی تک آزاد نہیں کیا

یہ "بار" صرف سفید فام کے حصہ ہی میں نہیں آیا بلکہ ہر ظالم اور ستمگر اُسے اٹھا کر قوم پر اپنے احسانات جتلاتا ہے۔ دورِ جدید میں اس بار کی ترجمانی کرنے کے لیے انقلابی عزائم کی خوشنما اصطلاح وضع کی گئی ہے۔ چنانچہ جب بھی کوئی "من چلا" اپنی ہوسِ اقتدار کو پورا کرنے کے لیے قوم کی گردن پر بالجبر مسلط ہوتا ہے تو وہ اپنی اس ہوس پرستی کو انقلاب کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے اور عوام کو مطمئن کرنے کے لیے کہتا ہے کہ اس کے پیشِ نظر چند انقلابی مقاصد ہیں جن کی تکمیل کے لیے اس نے یہ دردِ سر مول لیا ہے۔ ان مقاصد میں بجز لاف زنی کے اور کوئی چیز نہیں ہوتی۔

تفہیم القرآن

الزمر

(۲)

(اے نبی) ان سے کہو، مجھے حکم دیا گیا ہے کہ دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اُس کی بندگی کروں اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے میں خود مُسلم بنوں[۳۳]۔ کہو، اگر مَیں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے دن کے عذاب کا خوف ہے۔ کہہ دو کہ مَیں تو اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اسی کی بندگی کروں گا، تم اُس کے سوا جس جس کی بندگی کرنا چاہو کرتے رہو۔ کہو، اصل دیوالیے تو وہی ہیں جنہوں نے قیامت کے روز اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو گھاٹے میں ڈال دیا۔ خوب سن رکھو، یہی کھلا دیوالہ ہے[۳۴]۔

---

[۳۳] یعنی میرا کام صرف دوسروں سے کہنا ہی نہیں ہے، خود کر کے دکھانا بھی ہے۔ جس راہ پر لوگوں کو بلاتا ہوں اس پر سب سے پہلے مَیں خود چلتا ہوں۔

[۳۴] دیوالہ عُرفِ عام میں اس چیز کو کہتے ہیں کہ کاروبار میں آدمی کا لگایا ہوا سارا سرمایہ ڈوب جائے اور بازار میں اُس پر دوسروں کے مطالبے اتنے چڑھ جائیں کہ اپنا سب کچھ دے کر بھی وہ ان سے عہدہ برآ نہ ہو سکے۔ یہی استعارہ کفار و مشرکین کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہاں استعمال کیا ہے۔ انسان کو زندگی، عمر، عقل، جسم، قوتیں اور قابلیتیں، ذرائع اور مواقع جتنی چیزیں بھی دنیا میں حاصل ہیں، ان سب کا مجموعہ دراصل وہ سرمایہ ہے جسے وہ حیاتِ دنیا کے کاروبار میں لگاتا ہے۔ یہ سارا سرمایہ اگر کسی شخص نے اس مفروضے پر لگا دیا کہ کوئی خدا نہیں ہے، یا بہت سے خدا ہیں جن کا میں بندہ ہوں، اور کسی کو مجھے حساب نہیں دینا ہے، یا محاسبے کے وقت کوئی دوسرا مجھے آ کر بچا لے گا، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے گھاٹے کا سودا کیا اور اپنا سب کچھ ڈبو دیا۔ یہ ہے پہلا خُسران۔ دوسرا خُسران یہ ہے کہ اس غلط مفروضے پر اس نے جتنے کام بھی کیے ان سب میں وہ اپنے نفس سے لیکر دنیا کے بہت سے انسانوں اور آئندہ

اُن پر آگ کی چھتریاں اُوپر سے بھی چھائی ہونگی اور نیچے سے بھی۔ یہ وہ انجام ہے جس سے اللہ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے، پس اے میرے بندو، میرے غضب سے بچو۔ بخلاف اس کے جن لوگوں نے طاغوت ۳۵ کی بندگی سے اجتناب کیا اور اللہ کی طرف رجوع کر لیا اُن کے لیے خوشخبری ہے۔ پس (اے نبی) بشارت دے دو میرے اُن بندوں کو جو بات کو غور سے سنتے ہیں اور اس کے بہترین پہلو کی پیروی کرتے ہیں ۳۶۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت بخشی ہے اور یہی دانشمند ہیں۔

(اے نبی) اُس شخص کو کون بچا سکتا ہے جس پر عذاب کا فیصلہ چسپاں ہو چکا ہو ۳۷؟ کیا تم اُسے بچا سکتے ہو جو آگ میں گر چکا ہو؟ البتہ جو لوگ اپنے رب سے ڈر کر رہے اُن کے لیے بلند عمارتیں ہیں منزل پر منزل

نسلوں اور اللہ کی دوسری بہت سی مخلوق پر عمر بھر ظلم کرتا رہا۔ اس لیے اُس پر بے شمار مطالبات چڑھ گئے۔ مگر اُس کے پلّے کچھ نہیں ہے جس سے وہ ان مطالبات کا بھگتان بھگت سکے۔ اس پر مزید خسران یہ ہے کہ وہ خود ہی نہیں ڈوبا بلکہ اپنے بال بچوں اور عزیز و اقارب اور دوستوں اور ہم قوموں کو بھی اپنی غلط تعلیم و تربیت اور غلط مثال سے لے ڈوبا۔ یہی تین خسارے ہیں جن کے مجموعے کو اللہ تعالیٰ خُسرانِ مبین قرار دے رہا ہے۔

۳۵ طاغوت طغیان سے ہے جس کے معنی سرکشی کے ہیں۔ کسی کو طاغی (سرکش) کہنے کے بجائے اگر طاغوت (سرکشی) کہا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ انتہا درجے کا سرکش ہے۔ مثال کے طور پر کسی کو حسین کے بجائے اگر یہ کہا جائے کہ وہ حُسن ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ خوبصورتی میں درجۂ کمال کو پہنچا ہوا ہے۔ معبودانِ غیر اللہ کو طاغوت اس لیے کہا گیا ہے کہ اللہ کے سوا دوسرے کی بندگی کرنا تو صرف سرکشی ہے مگر جو دوسروں سے اپنی بندگی کرائے وہ کمال درجے کا سرکش ہے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد اوّل صفحات ۱۹۶-۱۹۷-۳۶۶-۳۶۷-۳۷۳- جلد دوم صفحہ ۵۴۰)۔ طاغوت کا لفظ یہاں طواغیت یعنی بہت سے طاغوتوں کے لیے استعمال کیا گیا ہے، اسی لیے اَنْ یَّعْبُدُوْھَا فرمایا گیا۔ اگر واحد مراد ہوتا تو یَعْبُدُوْہُ ہوتا۔

۳۶ اس آیت کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ ہر آواز کے پیچھے نہیں لگ جاتے بلکہ ہر ایک کی بات سن کر اُس پر غور کرتے ہیں اور جو حق بات ہوتی ہے اسے قبول کر لیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ بات کو سُن کر غلط معنی پہنانے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ اس کے اچھے اور بہتر پہلو کو اختیار کرتے ہیں۔

بنی ہوئی جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہونگی ۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے ، اللہ کبھی اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا ۔

کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا ، پھر اس کو سوتوں اور چشموں اور دریاؤں کی شکل[۳۸] میں زمین کے اندر جاری کیا ، پھر اس پانی کے ذریعہ سے وہ طرح طرح کی کھیتیاں نکالتا ہے جن کی قسمیں مختلف ہیں ، پھر وہ کھیتیاں پک کر سوکھ جاتی ہیں ، پھر تو دیکھتا ہے کہ وہ زرد پڑ گئیں ، پھر آخر کار اللہ اُن کو بُھس بنا دیتا ہے ۔ اِس میں ایک سبق ہے عقل رکھنے والوں کے لیے[۳۹] ع ۲ اب کیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا[۴۰] اور جو اپنے رب کی طرف سے ایک روشنی پر چل رہا ہے[۴۱] اُس شخص کی طرح ہو سکتا ہے

[۳۷] یعنی جس نے اپنے آپ کو خدا کے عذاب کا مستحق بنا لیا ہو اور اللہ نے فیصلہ کر لیا ہو کہ اسے اب سزا دینی ہے

[۳۸] اصل میں لفظ ینابیع استعمال ہوا ہے جس کا اطلاق ان تینوں چیزوں پر ہوتا ہے ۔

[۳۹] یعنی اس سے ایک صاحبِ عقل آدمی یہ سبق لیتا ہے کہ یہ دنیا کی زندگی اور اس کی زینتیں سب عارضی ہیں ۔ ہر بہار کا انجام خزاں ہے ۔ ہر شباب کا انجام ضعیفی اور موت ہے ۔ ہر عروج آخر کار زوال دیکھنے والا ہے لہٰذا یہ دنیا وہ چیز نہیں ہے جس کے حُسن پر فریفتہ ہو کر آدمی خدا اور آخرت کو بھول جائے اور یہاں کی چند روزہ بہار کے مزے لوٹنے کی خاطر وہ حرکتیں کرے جو اُس کی عاقبت برباد کر دیں ۔ پھر ایک صاحبِ عقل آدمی ان مناظر سے یہ سبق بھی لیتا ہے کہ اس دنیا کی بہار و خزاں اللہ ہی کے اختیار میں ہے ۔ اللہ جس کو چاہتا ہے پروان چڑھاتا ہے اور جسے چاہتا ہے خستہ و خراب کر دیتا ہے ۔ نہ کسی کے بس میں یہ ہے کہ اللہ جسے پروان چڑھا رہا ہو اس کو وہ پھلنے پھولنے سے روک دے ۔ اور نہ کوئی یہ طاقت رکھتا ہے کہ جسے اللہ غارت کرنا چاہے اسے وہ خاک میں ملنے سے بچا لے ۔

[۴۰] یعنی جسے اللہ نے یہ توفیق بخشی کہ اِن حقائق سے سبق لے اور اسلام کے حق ہونے پر مطمئن ہو جائے ۔ کسی بات پر آدمی کا شرح صدر ہو جانا یا سینہ کھل جانا دراصل اس کیفیت کا نام ہے کہ آدمی کے دل میں اُس بات کے متعلق کوئی خلجان یا تذبذب یا شک و شبہ باقی نہ رہے ، اور اُسے کسی خطرے کا احساس اور کسی نقصان کا اندیشہ بھی اُس بات کو قبول اور اختیار کرنے میں مانع نہ ہو ، بلکہ پورے اطمینان کے ساتھ وہ یہ فیصلہ کر لے کہ یہ چیز حق ہے

جس نے اِن باتوں سے کوئی سبق نہ لیا؟)- تباہی ہے اُن لوگوں کے لیے جن کے دل اللہ کی نصیحت سے اور زیادہ سخت ہو گئے[۴۲] وہ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔

لہٰذا خواہ کچھ ہو جائے مجھے اسی پر چلنا ہے۔ اس طرح کا فیصلہ کر کے جب آدمی اسلام کی راہ کو اختیار کر لیتا ہے تو خدا اور رسول کی طرف سے جو حکم بھی اسے ملتا ہے وہ اسے بکراہت نہیں بلکہ برضا و رغبت مانتا ہے۔ کتاب و سنت میں جو عقائد و افکار اور جو اصول و قواعد بھی اس کے سامنے آتے ہیں وہ انہیں اس طرح قبول کرتا ہے کہ گویا یہی اس کے دل کی آواز ہے۔ کسی ناجائز فائدے کو چھوڑنے پر اسے کوئی پچھتاوا لاحق نہیں ہوتا بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ میرے لیے وہ سرے سے کوئی فائدہ تھا ہی نہیں، اُلٹا ایک نقصان تھا جس سے بفضلِ خدا میں بچ گیا۔ اسی طرح کوئی نقصان بھی اگر راستی پر قائم رہنے کی صورت میں اسے پہنچے تو وہ اس پر افسوس نہیں کرتا بلکہ ٹھنڈے دل سے اسے برداشت کرتا ہے اور اللہ کی راہ سے منہ موڑنے کی بہ نسبت وہ نقصان اسے ہلکا نظر آتا ہے یہی حال اس کا خطرات پیش آنے پر بھی ہوتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میرے لیے کوئی دوسرا راستہ سرے سے ہی نہیں کہ اس خطرے سے بچنے کے لیے اُدھر نکل جاؤں۔ اللہ کا سیدھا راستہ ایک ہی ہے جس پر مجھے بہر حال چلنا ہے۔ خطرہ آتا ہے تو آتا رہے۔

[۴۱] یعنی کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی صورت میں ایک نورِ علم اسے مل گیا ہے جس کے اُجالے میں وہ ہر ہر قدم پر صاف دیکھتا جاتا ہے کہ زندگی کی بے شمار رنگ ڈنڈیوں کے درمیان حق کا سیدھا راستہ کونسا ہے۔

[۴۲] شرحِ صدر کے مقابلے میں انسانی قلب کی دو ہی کیفیتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک ضیقِ صدر (سینہ تنگ ہو جانے اور دل بھنچ جانے) کی کیفیت جس میں کچھ نہ کچھ گنجائش اس بات کی رہ جاتی ہے کہ حق اُس میں نفوذ کر جائے؛ اور دوسری قساوتِ قلب (دل کے پتھر ہو جانے) کی کیفیت جس میں حق کے لیے نفوذ یا سرایت کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ اِس دوسری کیفیت کے متعلق فرماتا ہے کہ جو شخص اس حد تک پہنچ جائے اس کے لیے پھر کامل تباہی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر کوئی شخص، خواہ دل کی تنگی ہی کے ساتھ سہی، ایک مرتبہ قبولِ حق کے لیے کسی طرح تیار ہو جائے تو اس کے لیے بچ نکلنے کا کچھ نہ کچھ امکان ہوتا ہے۔ یہ دوسرا مضمون آیت کے فحویٰ سے خود بخود نکلتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے اس کی صراحت نہیں فرمائی ہے، کیونکہ آیت کا اصل مقصود

اللہ نے بہترین کلام اتارا ہے، ایک ایسی کتاب جس کے تمام اجزاء ہم رنگ ہیں[۴۳] اور جس میں بار بار مضامین دہرائے گئے ہیں۔ اُسے سن کر ان لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرنے والے ہیں، اور پھر ان کے جسم اور ان کے دل نرم ہو کر اللہ کے ذکر کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے جس سے وہ راہِ راست پر لے آتا ہے جسے چاہتا ہے۔ اور جسے اللہ ہی ہدایت نہ دے اس کے لیے پھر کوئی ہادی نہیں ہے۔ اب اس شخص کی بدحالی کا تم کیا اندازہ کر سکتے ہو جو قیامت کے روز عذاب کی سخت مار اپنے منہ پر لے گا؟[۴۴] ایسے ظالموں سے تو کہہ دیا جائے گا کہ اب چکھو مزہ اُس کمائی کا جو تم کرتے رہے تھے[۴۵]۔ ان سے پہلے بھی بہت سے لوگ اسی طرح جھٹلا چکے ہیں۔ آخر اُن پر عذاب ایسے رُخ سے آیا جدھر ان کا خیال بھی نہ جا سکتا تھا۔ پھر اللہ نے ان کو دنیا ہی کی زندگی

اُن لوگوں کو متنبہ کرنا تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں ضد اور ہٹ دھرمی پر تلے ہوئے تھے اور فیصلہ کیے بیٹھے تھے کہ آپ کی کوئی بات مان کر نہیں دینی ہے۔ اس پر انہیں خبردار کیا گیا ہے کہ تم تو اپنی اس ہیکڑی کو بڑی قابلِ فخر چیز سمجھ رہے ہو، مگر فی الحقیقت ایک انسان کی اس سے بڑھ کر کوئی نالائقی اور بدنصیبی نہیں ہو سکتی کہ اللہ کا ذکر اور اس کی طرف سے آئی ہوئی نصیحت سن کر وہ نرم پڑنے کے بجائے اور زیادہ سخت ہو جائے۔

۴۳ یعنی ان میں کوئی تضاد اور اختلاف نہیں ہے۔ پوری کتاب اوّل سے لیکر آخر تک ایک ہی مدعا، ایک ہی عقیدے اور ایک ہی نظامِ فکر و عمل کو پیش کرتی ہے۔ اس کا ہر جزو دوسرے جز کی اور ہر مضمون دوسرے مضمون کی تصدیق و تائید اور توضیح و تشریح کرتا ہے۔ اور معنی و بیان، دونوں کے لحاظ سے اس میں کامل یکسانی (CONSISTENCY) پائی جاتی ہے۔

۴۴ کسی ضرب کو آدمی اپنے منہ پر اس وقت لیتا ہے جبکہ وہ بالکل عاجز و بے بس ہو۔ ورنہ جب تک وہ مدافعت پر کچھ بھی قادر رہتا ہے وہ اپنے جسم کے ہر حصے پر چوٹ کھاتا رہتا ہے مگر منہ پر مار نہیں پڑنے دیتا۔ اس لیے یہاں اُس شخص کی انتہائی بے بسی کی تصویر یہ کہہ کر کھینچ دی گئی ہے کہ وہ سخت مار اپنے منہ پر لیگا۔

۴۵ اصل میں لفظ "کسب" استعمال ہوا ہے جس سے مراد قرآن مجید کی اصطلاح میں جزاء و سزا کا وہ استحقاق ہے جو آدمی اپنے عمل کے نتیجے میں کماتا ہے۔ نیک عمل کرنے والے کی اصل کمائی یہ ہے کہ وہ اللہ

میں رسوائی کا مزہ چکھایا، اور آخرت کا عذاب تو اس سے شدید تر ہے، کاش یہ لوگ جانتے۔

ہم نے اس قرآن میں لوگوں کو طرح طرح کی مثالیں دی ہیں کہ یہ ہوش میں آئیں۔ ایسا قرآن جو عربی زبان میں ہے[۴۶]، جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں ہے[۴۷]، تاکہ یہ بُرے انجام سے بچیں۔ اللہ ایک مثال دیتا ہے۔ ایک شخص تو وہ ہے جس کی ملکیت میں بہت سے کج خلق آقا شریک ہیں جو اسے اپنی اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ اور دوسرا شخص پُورا کا پُورا ایک ہی آقا کا غلام ہے۔ کیا ان دونوں کا حال یکساں ہو سکتا ہے[۴۸]؟

نکے اجر کا مستحق بنتا ہے۔ اور گمراہی و بدراہی اختیار کرنے والے کی کمائی وہ سزا ہے جو اسے آخرت میں ملنے والی ہے

[۴۶] یعنی یہ کسی غیر زبان میں نہیں آیا ہے کہ مکے اور عرب کے لوگ اسے سمجھنے کے لیے کسی مترجم یا شارح کے محتاج ہوں، بلکہ یہ ان کی اپنی زبان میں ہے جسے یہ براہِ راست خود سمجھ سکتے ہیں۔

[۴۷] یعنی اس میں ایچ پیچ کی بھی کوئی بات نہیں ہے کہ عام آدمی کے لیے اس کو سمجھنے میں کوئی مشکل پیش آئے۔ بلکہ صاف صاف سیدھی بات کہی گئی ہے جس سے ہر آدمی جان سکتا ہے کہ یہ کتاب کس چیز کو غلط کہتی ہے اور کیوں، کس چیز کو صحیح کہتی ہے اور کس بنا پر، کیا منوانا چاہتی ہے، کس چیز کا انکار کرانا چاہتی ہے، کن کاموں کا حکم دیتی ہے، اور کن کاموں سے روکتی ہے۔

[۴۸] اس مثال میں اللہ تعالیٰ نے شرک اور توحید کے فرق اور انسان کی زندگی پر دونوں کے اثرات کو اس طرح کھول کر بیان فرما دیا ہے کہ اس سے زیادہ مختصر الفاظ میں اتنا بڑا مضمون اتنے مؤثر طریقے سے سمجھا دینا ممکن نہیں ہے۔ یہ بات ہر آدمی تسلیم کرے گا کہ جس شخص کے بہت سے مالک یا آقا ہوں، اور ہر ایک اس کو اپنی اپنی طرف کھینچ رہا ہو، اور وہ مالک بھی ایسے بد مزاج ہوں کہ ہر ایک اس سے خدمت لیتے ہوئے دوسرے مالک کے حکم پر دوڑنے کی اسے مہلت نہ دیتا ہو، اور ان کے متضاد احکام میں جس کے حکم کی بھی وہ تعمیل سے قاصر رہ جائے وہ اسے ڈانٹنے پھٹکارنے ہی پر اکتفا نہ کرتا ہو بلکہ سزا دینے پر تل جاتا ہو، اس کی زندگی لامحالہ سخت ضیق میں ہو گی۔ اور اس کے برعکس وہ شخص بڑے چین اور آرام سے رہے گا جو بس ایک ہی آقا کا نوکر یا غلام ہو اور کسی دوسرے کی خدمت و رضا جوئی اسے نہ کرنی پڑے۔ یہ ایسی سیدھی

سی بات ہے جسے سمجھنے کے لیے کسی بڑے غور و تامّل کی حاجت نہیں ہے۔ اس کے بعد کسی شخص کے لیے یہ سمجھنا بھی مشکل نہیں رہتا کہ انسان کے لیے جو امن و اطمینان ایک خدا کی بندگی میں ہے وہ بہت سے خداؤں کی بندگی میں اسے کبھی میسر نہیں آسکتا۔

اس مقام پر یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ بہت سے کج خُلق اور باہم متنازع آقاؤں کی تمثیل پتھر کے بتوں پر راست نہیں آتی بلکہ اُن جیتے جاگتے آقاؤں پر ہی راست آتی ہے جو عملاً آدمی کو متضاد احکام دیتے ہیں اور فی الواقع اس کو اپنی اپنی طرف کھینچتے رہتے ہیں۔ پتھر کے بُت کسے حکم دیا کرتے ہیں اور کب کسی کو کھینچ کر اپنی خدمت کے لیے بلاتے ہیں۔ یہ کام تو زندہ آقاؤں ہی کے کرنے کے ہیں۔ ایک آقا آدمی کے اپنے نفس میں بیٹھا ہوا ہے جو طرح طرح کی خواہشات اس کے سامنے پیش کرتا ہے اور اسے مجبور کرتا رہتا ہے کہ وہ انہیں پورا کرے۔ دوسرے بے شمار آقا گھر میں، خاندان میں، برادری میں، قوم اور ملک کے معاشرے میں، مذہبی پیشواؤں میں، حکمرانوں اور قانون سازوں میں، کاروبار اور معیشت کے دائروں میں، اور دنیا کے تمدّن پر غلبہ رکھنے والی طاقتوں میں ہر طرف موجود ہیں جن کے متضاد تقاضے اور مختلف مطالبے ہر وقت آدمی کو اپنی اپنی طرف کھینچتے رہتے ہیں اور ان میں سے جس کا تقاضا پُورا کرنے میں بھی وہ کوتاہی کرتا ہے وہ اپنے دائرۂ کار میں اس کو سزا دیئے بغیر نہیں چھوڑتا۔ البتہ ہر ایک کی سزا کے ہتھیار الگ الگ ہیں۔ کوئی دل مسوستا ہے۔ کوئی روٹھ جاتا ہے۔ کوئی نکّو بناتا ہے۔ کوئی مقاطعہ کرتا ہے۔ کوئی دیوالہ نکالتا ہے۔ کوئی مذہب کا وار کرتا ہے اور کوئی قانون کی چوٹ لگاتا ہے۔ اِس ضیق سے نکلنے کی کوئی صورت انسان کے لیے اس کے سوا نہیں ہے کہ وہ توحید کا مسلک اختیار کر کے صرف ایک خدا کا بندہ بن جائے۔ اور ہر دوسرے کی بندگی کا قلادہ اپنی گردن سے اتار پھینکے۔

توحید کا مسلک اختیار کرنے کی بھی دو شکلیں ہیں جن کے نتائج الگ الگ ہیں۔

ایک شکل یہ ہے کہ ایک فرد اپنی انفرادی حیثیت میں خدائے واحد کا بندہ بن کر رہنے کا فیصلہ کرلے اور گرد و پیش کا ماحول اس معاملے میں اس کا ساتھی نہ ہو۔ اس صورت میں یہ تو ہو سکتا ہے کہ خارجی کشمکش اور ضیق اس کے لیے پہلے سے بھی زیادہ بڑھ جائے، لیکن اگر اس نے سچے دل سے یہ مسلک اختیار کیا ہو تو اسے

داخلی امن و اطمینان لازماً میسر آجائے گا۔ وہ نفس کی ہر اس خواہش کو رد کر دے گا جو احکامِ الٰہی کے خلاف ہو یا جسے پورا کرنے کے ساتھ خدا پرستی کے تقاضے پورے نہ کیے جا سکتے ہوں۔ وہ خاندان، برادری، قوم، حکومت، مذہبی پیشوائی اور معاشی اقتدار کے بھی کسی ایسے مطالبے کو قبول نہ کرے گا جو خدا کے قانون سے ٹکراتا ہو۔ اس کے نتیجے میں اسے بے حد تکلیفیں پہنچ سکتی ہیں، بلکہ لازماً پہنچیں گی۔ لیکن اس کا دل پوری طرح مطمئن ہو گا کہ جس خدا کا میں بندہ ہوں اس کی بندگی کا تقاضا پورا کر رہا ہوں، اور جن کا بندہ میں نہیں ہوں ان کا مجھ پر کوئی حق نہیں ہے جس کی بنا پر میں اپنے رب کے حکم کے خلاف ان کی بندگی بجا لاؤں۔ یہ دل کا اطمینان اور روح کا امن و سکون دنیا کی کوئی طاقت اس سے نہیں چھین سکتی۔ حتیٰ کہ اگر اسے پھانسی پر بھی چڑھنا پڑ جائے تو وہ ٹھنڈے دل سے چڑھ جائے گا اور اس کو ذرا پچھتاوا نہ ہو گا کہ میں نے کیوں نہ جھوٹے خداؤں کے آگے سر جھکا کر اپنی جان بچالی۔

دوسری شکل یہ ہے کہ پورا معاشرہ اسی توحید کی بنیاد پر قائم ہو جائے اور اس میں اخلاق، تمدن، تہذیب، تعلیم، مذہب، قانون، رسم و رواج، سیاست، معیشت، غرض ہر شعبۂ زندگی کے لیے وہ اصول اعتقاداً مان لیے جائیں اور عملاً رائج ہو جائیں جو خداوند عالم نے اپنی کتاب اور اپنے رسول کے ذریعہ سے دیئے ہیں۔ خدا کا دین جس کو گناہ کہتا ہے، قانون اسی کو جرم قرار دے، حکومت کی انتظامی مشین اسی کو مٹانے کی کوشش کرے، تعلیم و تربیت اسی سے بچنے کے لیے ذہن اور کردار تیار کرے، منبر و محراب سے اسی کے خلاف آواز بلند ہو، معاشرہ اسی کو معیوب ٹھیرائے اور معیشت کے ہر کاروبار میں وہ ممنوع ہو جائے۔ اسی طرح خدا کا دین جس چیز کو بھلائی اور نیکی قرار دے، قانون اس کی حمایت کرے، انتظام کی طاقتیں اسے پروان چڑھانے میں لگ جائیں، تعلیم و تربیت کا پورا نظام ذہنوں میں اس کو بٹھانے اور سیرتوں میں اسے رچا دینے کی کوشش کرے، منبر و محراب اسی کی تلقین کریں، معاشرہ اسی کی تعریف کرے اور اپنے عملی رسم و رواج اس پر قائم کر دے، اور کاروبارِ معیشت بھی اسی کے مطابق چلے۔ یہ وہ صورت ہے جس میں انسان کو کامل داخلی و خارجی اطمینان میسر آجاتا ہے اور مادی و روحانی ترقی کے تمام دروازے اس کے لیے کھل جاتے ہیں، کیونکہ اس میں بندگیٔ رب اور بندگیٔ غیر کے تقاضوں کا تصادم قریب قریب ختم ہو جاتا ہے۔

اسلام کی دعوت اگرچہ ہر ہر فرد کو یہی ہے کہ خواہ دوسری صورت پیدا ہو یا نہ ہو، بہر حال وہ توحید کو

—— الحمد للہ،[۴۹] مگر اکثر لوگ نادانی میں پڑے ہوئے ہیں۔[۵۰] (اے نبی) تمہیں بھی مرنا ہے اور ان لوگوں کو بھی مرنا ہے۔[۵۱] آخر کار قیامت کے روز تم سب اپنے رب کے حضور اپنا اپنا مقدمہ پیش کرو گے۔ ع پھر اس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہوگا جس نے اللہ پر جھوٹ باندھا اور جب سچائی اس کے سامنے آئی تو اُسے جھٹلا دیا۔ کیا ایسے کافروں کے لیے جہنم میں کوئی ٹھکانا نہیں ہے؟ اور جو شخص سچائی لے کر آیا اور جنہوں نے اس کو سچ مانا، وہی عذاب سے بچنے والے ہیں۔[۵۲] انہیں اپنے رب کے ہاں وہ سب کچھ ملے گا جس کی وہ

اپنا دین بنا سے اور تمام خطرات و مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے اللہ کی بندگی کرے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام کا آخری مقصود یہی دوسری صورت پیدا کرنا ہے اور تمام انبیاء علیہم السلام کی کوششوں کا مدعا یہی رہا ہے کہ ایک امتِ مسلمہ وجود میں آئے جو کفر اور کفار کے غلبے سے آزاد ہو کر من حیث الجماعت اللہ کے دین کی پیروی کرے۔ کوئی شخص جب تک قرآن و سنت سے ناواقف اور عقل سے بے بہرہ نہ ہو، یہ نہیں کہہ سکتا کہ انبیاء علیہم السلام کی سعی و جہد کا مقصود صرف انفرادی ایمان و طاعت ہے، اور اجتماعی زندگی میں دینِ حق کو نافذ و قائم کرنا سرے سے ان کا مقصد ہی نہیں رہا ہے۔

۴۹؎ یہاں الحمد للہ کی معنویت سمجھنے کے لیے یہ نقشہ ذہن میں لائیے کہ اوپر کا سوال لوگوں کے سامنے پیش کرنے کے بعد مقرر نے سکوت کیا تاکہ اگر مخالفینِ توحید کے پاس اس کا کوئی جواب ہو تو دیں۔ پھر جب ان سے کوئی جواب بن نہ پڑا اور کسی طرف سے یہ آواز نہ آئی کہ دونوں برابر ہیں، تو مقرر نے کہا الحمد للہ۔ یعنی خدا کا شکر ہے کہ تم خود بھی اپنے دلوں میں ان دونوں حالتوں کا فرق محسوس کرتے ہو اور تم میں سے کوئی بھی یہ کہنے کی جرأت نہیں رکھتا کہ ایک آقا کی بندگی سے بہت سے آقاؤں کی بندگی بہتر ہے یا دونوں یکساں ہیں۔

۵۰؎ یعنی ایک آقا کی غلامی اور بہت سے آقاؤں کی غلامی کا فرق تو خوب سمجھ لیتے ہیں مگر ایک خدا کی بندگی اور بہت سے خداؤں کی بندگی کا فرق جب سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے تو نادان بن جاتے ہیں۔

۵۱؎ پچھلے فقرے اور اس فقرے کے درمیان ایک لطیف خلا ہے جسے موقع و محل اور سیاق و سباق پر غور کر کے ہر صاحب فہم آدمی خود بھر سکتا ہے۔ اس میں یہ مضمون پوشیدہ ہے کہ اس طرح تم ایک صاف سیدھی بات سیدھے طریقے سے ان لوگوں کو سمجھا رہے ہو اور یہ لوگ نہ صرف یہ کہ ہٹ دھرمی سے تمہاری بات رد کر رہے

خواہش کریں گے۵۳۔ یہ ہے نیکی کرنے والوں کی جزا۔ تاکہ جو بدترین اعمال انہوں نے کیے تھے انہیں اللہ ان کے حساب سے ساقط کر دے اور جو بہترین اعمال وہ کرتے رہے اُن کے لحاظ سے ان کو اجر عطا فرمائے۵۴۔

(اے نبی) کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے؟ یہ لوگ اُس کے سوا دوسروں سے

ہیں، بلکہ اس کھلی صداقت کو دبانے کے لیے تمہارے درپے آزار ہیں۔ اچھا، ہمیشہ نہ تمہیں رہنا ہے نہ انہیں۔ دونوں کو ایک دن مرنا ہے۔ انجام سب کے سامنے آجائے گا۔

۵۲۔ مطلب یہ ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کی عدالت میں جو مقدمہ ہونا ہے اس میں سزا پانے والے کون ہوں گے، یہ بات تم آج ہی سُن لو۔ سزا لازماً انہی ظالموں کو ملنی ہے جنہوں نے یہ جھوٹے عقیدے گھڑے کہ اللہ کے ساتھ اس کی ذات، صفات، اختیارات اور حقوق میں کچھ دوسری ہستیاں بھی شریک ہیں، اور اس سے بھی زیادہ بڑھ کر ان کا ظلم یہ ہے کہ جب ان کے سامنے سچائی پیش کی گئی تو انہوں نے اسے مان کر نہ دیا بلکہ اُلٹا اُسی کو جھوٹا قرار دیا جس نے سچائی پیش کی۔ رہا وہ شخص جو سچائی لایا اور وہ لوگ جنہوں نے اس کی تصدیق کی، تو ظاہر ہے کہ اللہ کی عدالت سے ان کے سزا پانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۵۳۔ یہ بات ملحوظ رہے کہ یہاں فی الجنّۃ (جنت میں) نہیں بلکہ عِندَ رَبِّهِمْ (ان کے رب کے ہاں) کے الفاظ ارشاد ہوئے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اپنے رب کے ہاں تو بندہ مرنے کے بعد ہی پہنچ جاتا ہے۔ اس لیے آیت کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں پہنچ کر ہی نہیں بلکہ مرنے کے وقت سے دخولِ جنت تک کے زمانے میں بھی مومنِ صالح کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ یہی رہے گا۔ وہ عذابِ برزخ سے، روزِ قیامت کی سختیوں سے، حساب کی سخت گیری سے، اپنی کوتاہیوں اور قصوروں پر مواخذہ سے لازماً بچنا چاہے گا اور اللہ جل شانہٗ اس کی یہ ساری خواہشات پُوری فرمائے گا۔

۵۴۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جو لوگ ایمان لائے تھے، زمانۂ جاہلیت میں ان سے اعتقادی اور اخلاقی دونوں ہی طرح کے بدترین گناہ سرزد ہو چکے تھے۔ اور ایمان لانے کے بعد انہوں نے صرف یہی ایک نیکی نہ کی تھی کہ اُس جھوٹ کو چھوڑ دیا جسے وہ پہلے مان رہے تھے اور وہ سچائی قبول کر لی جسے حضورؐ نے پیش فرمایا تھا،

تم کو ڈراتے ہیں۵۵۔ حالانکہ اللہ جسے گمراہی میں ڈال دے اسے کوئی راستہ دکھانے والا نہیں، اور جسے وہ ہدایت دے اسے بھٹکانے والا بھی کوئی نہیں، کیا اللہ زبردست اور انتقام لینے والا نہیں ہے۵۶۔ ان لوگوں سے اگر تم پوچھو کہ زمین اور آسمانوں کو کس نے پیدا کیا ہے تو یہ خود کہیں گے کہ اللہ نے۔ ان سے کہو، جب حقیقت یہ ہے تو تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر اللہ مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو کیا تمہاری یہ دیویاں مجھے اس کے پہنچاتے ہوئے نقصان سے بچا لینگی؟ یا اللہ مجھ پر مہربانی کرنا چاہے تو کیا یہ اس کی رحمت کو روک سکیں گی؟ بس ان سے کہدو کہ میرے لیے اللہ ہی کافی ہے، بھروسہ کرنے والے اُسی پر بھروسہ کرتے ہیں۵۷۔ ان سے صاف کہو کہ "اے میری قوم کے لوگو، تم اپنی جگہ اپنا کام کیے

بلکہ مزید براں انہوں نے اخلاق، عبادات اور معاملات میں بہترین اعمالِ صالحہ انجام دیئے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان کے وہ بدترین اعمال جو جاہلیت میں ان سے سرزد ہوتے تھے ان کے حساب سے محو کر دیئے جائیں گے، اور ان کو انعام اُن اعمال کے لحاظ سے دیا جائے گا جو ان کے نامۂ اعمال میں سب سے بہتر ہونگے۔

۵۵۔ کفارِ مکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کرتے تھے کہ تم ہمارے معبودوں کی شان میں گستاخیاں کرتے ہو اور اِن کے خلاف زبان کھولتے ہو۔ تمہیں معلوم نہیں ہے کہ یہ کیسی زبردست باکرامت ہستیاں ہیں۔ ان کی توہین تو جس نے بھی کی وہ برباد ہو گیا۔ تم بھی اگر اپنی باتوں سے باز نہ آئے تو یہ تمہارا تختہ اُلٹ دیں گے۔

۵۶۔ یعنی یہ بھی ہدایت سے ان کی محرومی ہی کا کرشمہ ہے کہ ان احمقوں کو اپنے ان معبودوں کی طاقت و عزت کا تو بڑا خیال ہے، مگر انہیں اس بات کا خیال کبھی نہیں آتا کہ اللہ بھی کوئی زبردست ہستی ہے اور شرک کر کے اُس کی جو توہین یہ کر رہے ہیں اُس کی بھی کوئی سزا انہیں مل سکتی ہے۔

۵۷۔ ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے روایت نقل کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا من احب ان یکون اقوی الناس فلیتوکل علی اللہ، ومن احب ان یکون اغنی الناس فلیکن بما فی ید اللہ عزوجل اوثق منہ بما فی یدیہ، ومن احب ان یکون اکرم الناس فلیتق اللہ عزوجل۔ "جو شخص یہ چاہتا ہو کہ سب انسانوں سے زیادہ طاقتور ہو جائے اسے چاہیے کہ اللہ پر توکل کرے۔ اور جو شخص چاہتا ہو کہ سب سے بڑھ کر غنی ہو جائے اُسے چاہیے کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے اُس پر زیادہ بھروسہ رکھے بہ نسبت اس چیز کے جو اُس کے

جاؤ[58]، مَیں اپنا کام کرتا رہوں گا، عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس پر رسوا کن عذاب آتا ہے اور کسے وہ سزا ملتی ہے جو کبھی ٹلنے والی نہیں۔ (اے نبیؐ) ہم نے سب انسانوں کے لیے یہ کتاب برحق نازل کر دی ہے۔ اب جو سیدھا راستہ اختیار کرے گا اپنے لیے کرے گا اور جو بھٹکے گا اس کے بھٹکنے کا وبال اسی پر ہو گا، تم اُن کے ذمہ دار نہیں ہو[59]۔ ع

وہ اللہ ہی ہے جو موت کے وقت رُوحیں قبض کرتا ہے اور جو ابھی نہیں مرا ہے اس کی رُوح نیند میں قبض کر لیتا ہے[60]، پھر جس پر وہ موت کا فیصلہ نافذ کرتا ہے اسے روک لیتا ہے اور دوسروں کی روحیں ایک وقت مقرر کے لیے واپس بھیج دیتا ہے۔ اِس میں بڑی نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرنے والے ہیں[61]۔ کیا اس خدا کو چھوڑ کر اِن لوگوں نے دوسروں کو شفیع بنا رکھا ہے[62]؟

اپنے ہاتھ میں ہے، اور جو شخص چاہتا ہو کہ سب سے زیادہ عزت والا ہو جائے اُسے چاہیے کہ اللہ عزوجل سے ڈرے"۔

۵۸؎ یعنی مجھے زک دینے کے لیے جو کچھ تم کر رہے ہو اور کر سکتے ہو وہ کیے جاؤ، اپنی کرنی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھو۔

۵۹؎ یعنی تمہارے سپرد یہ نہیں راہِ راست پر لے آنا نہیں ہے۔ تمہارا کام صرف یہ ہے کہ ان کے سامنے راہِ راست پیش کر دو۔ اس کے بعد اگر یہ گمراہ رہیں تو تم پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

۶۰؎ نیند کی حالت میں روح قبض کرنے سے مراد احساس و شعور، فہم و ادراک اور اختیار و ارادہ کی قوتوں کو معطل کر دینا ہے۔ یہ ایک ایسی حالت ہے جس پر اردو زبان کی یہ کہاوت فی الواقع راست آتی ہے کہ سویا اور موا برابر۔

۶۱؎ اس ارشاد سے اللہ تعالیٰ ہر انسان کو یہ احساس دلانا چاہتا ہے کہ موت اور زیست کس طرح اُس کے دستِ قدرت میں ہے۔ کوئی شخص بھی یہ ضمانت نہیں رکھتا کہ رات کو جب وہ سوئے گا تو صبح لازماً زندہ ہی اُٹھے گا۔ کسی کو بھی یہ معلوم نہیں کہ ایک گھڑی بھر میں اُس پر کیا آفت آ سکتی ہے اور دوسرا لمحہ اُس پر زندگی کا لمحہ ہوتا ہے یا موت کا۔ ہر وقت سوتے میں یا جاگتے میں، گھر بیٹھے یا کہیں چلتے پھرتے آدمی کے

ان سے کہو، کیا وہ شفاعت کریں گے خواہ ان کے اختیار میں کچھ نہ ہو اور وہ سمجھتے بھی نہ ہوں ؟
کہو، شفاعت ساری کی ساری اللہ کے اختیار میں ہے ۶۳۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا
وہ مالک ہے۔ پھر اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو۔
جب اکیلے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو آخرت پر ایمان نہ رکھنے والوں کے دل کُڑھنے لگتے ہیں
اور جب اُس کے سوا دوسروں کا ذکر ہوتا ہے تو یکایک وہ خوشی سے کِھل اُٹھتے ہیں ۶۴۔ کہو، خدایا،

جسم کی کوئی اندرونی خرابی، یا باہر سے کوئی نامعلوم آفت یکایک وہ شکل اختیار کر سکتی ہے جو اُس کے لیے پیامِ موت ثابت ہو۔ اِس طرح جو انسان خدا کے ہاتھ میں بے بس ہے وہ کیسا سخت نادان ہے اگر اُسی خدا سے غافل یا منحرف ہو۔

۶۲ یعنی ایک تو ان لوگوں نے اپنے طور پر خود ہی یہ فرض کر لیا کہ کچھ ہستیاں اللہ کے ہاں بڑی زور آور ہیں جن کی سفارش کسی طرح ٹل نہیں سکتی، حالانکہ اُن کے سفارشی ہونے پر نہ کوئی دلیل، نہ اللہ تعالیٰ نے کبھی یہ فرمایا کہ ان کو میرے ہاں یہ مرتبہ حاصل ہے، اور نہ خود اُن ہستیوں نے کبھی یہ دعویٰ کیا کہ ہم اپنے زور سے تمہارے سارے کام بنوا دیا کریں گے۔ اس پر مزید حماقت اِن لوگوں کی یہ ہے کہ اصل مالک کو چھوڑ کر ان فرضی سفارشیوں ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے ہیں اور ان کی ساری نیاز مندیاں انہی کے لیے وقف ہیں۔

۶۳ یعنی کسی کا یہ زور نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں خود سفارشی بن کر اُٹھ ہی سکے، کجا کہ اپنی سفارش منوا لینے کی طاقت بھی اُس میں ہو۔ یہ بات تو بالکل اللہ کے اختیار میں ہے کہ جسے چاہے سفارش کی اجازت دے اور جسے چاہے نہ دے، اور جس کے حق میں چاہے کسی کو سفارش کرنے دے اور جس کے حق میں چاہے نہ کرنے دے۔ (شفاعت کے اسلامی عقیدے اور مشرکانہ عقیدے کا فرق سمجھنے کے لیے حسبِ ذیل مقامات ملاحظہ ہوں۔ تفہیم القرآن جلد اول، ص ۱۹۴-۵۴۳۔ جلد دوم صفحات ۲۶۲-۲۷۵-۲۷۶-۳۵۶-۳۶۸-۴۴۹-۵۵۶-۵۵۷-۵۶۲۔ جلد سوم صفحات ۱۲۶-۱۲۷-۱۵۵-۱۵۶-۲۵۲۔)

۶۴ یہ بات قریب قریب ساری دنیا کے مشرکانہ ذوق رکھنے والے لوگوں میں مشترک ہے، حتیٰ کہ مسلمانوں میں بھی جن بدقسمتوں کو یہ بیماری لگ گئی ہے وہ بھی اس عیب سے خالی نہیں ہیں۔ زبان سے کہتے ہیں کہ ہم اللہ کو مانتے

آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے، حاضر و غائب کے جاننے والے، تو ہی اپنے بندوں کے درمیان اُس چیز کا فیصلہ کرے گا جس میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں۔ اگر ان ظالموں کے پاس زمین کی ساری دولت بھی ہو، اور اتنی ہی اور بھی، تو یہ روزِ قیامت کے بُرے عذاب سے بچنے کے لیے سب کچھ فدیے میں دینے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ وہاں اللہ کی طرف سے ان کے سامنے وہ کچھ آئے گا جس کا انہوں نے کبھی اندازہ ہی نہیں کیا ہے۔ وہاں اپنی کمائی کے سارے بُرے نتائج ان پر کھل جائیں گے اور وہی چیز ان پر مسلط ہو جائے گی جس کا یہ مذاق اڑاتے رہے ہیں۔

ہیں۔ لیکن حالت یہ ہے کہ اکیلے اللہ کا ذکر کیجیے تو ان کے چہرے بگڑنے لگتے ہیں۔ کہتے ہیں، ضرور یہ شخص بزرگوں اور اولیاء کو نہیں مانتا، جبھی تو بس اللہ ہی اللہ کی باتیں کیے جاتا ہے۔ اور اگر دوسروں کا ذکر کیا جائے تو ان کے دلوں کی کلی کھل جاتی ہے اور بشاشت سے ان کے چہرے دمکنے لگتے ہیں۔ اس طرزِ عمل سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو اصل میں دلچسپی اور محبت کس سے ہے۔ علامہ آلوسی نے تفسیر روح المعانی میں اس مقام پر خود اپنا ایک تجربہ بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ایک روز میں نے دیکھا کہ ایک شخص اپنی کسی مصیبت میں ایک وفات یافتہ بزرگ کو مدد کے لیے پکار رہا ہے۔ میں نے کہا اللہ کے بندے، اللہ کو پکار، وہ خود فرماتا ہے کہ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔ میری یہ بات سن کر اسے سخت غصہ آیا اور بعد میں لوگوں نے مجھے بتایا کہ وہ کہتا تھا یہ شخص اولیاء کا منکر ہے اور بعض لوگوں نے اس کو یہ کہتے بھی سنا کہ اللہ کی بہ نسبت ولی جلدی سُن لیتے ہیں۔

قادیانیوں کے بعض دلائل کا علمی جائزہ

(قاضی عبد النبی کوکب)

انکارِ ختمِ نبوت کے فتنے کو تقویت دینے کے لیے قادیانیوں کی طرف سے آئے دن تازہ لٹریچر شائع ہوتا رہتا ہے۔ مگر اس کی تازگی محض طباعتی زیبائش کی جدت تک ہی محدود ہوتی ہے۔ اندر سے مواد وہی نکلتا ہے جس کے تکرار و اعادہ کا سلسلہ برسوں سے جاری ہے۔ قادیانیت کے آغاز ہی سے لوگ دیکھتے چلے آئے ہیں کہ اس کے علمبردار کتاب و سنّت کی بیّن اور روشن تصریحات سے ہٹ کر، بس چند اقوال و عبارات کی اوٹ میں اپنی کمینگاہ تیار کرتے ہیں۔

پھر جن اقوال و عبارات کو یہ لوگ پیش کرتے ہیں، ان کی بھی یہ حیثیت ہرگز نہیں ہوتی کہ اُن میں مؤلفین نے مسئلہ ختمِ نبوت سے مستقلاً بحث کی ہو۔ بلکہ وہ دوسرے مباحث کی جُزوی اور ضمنی حیثیت کی عبارات ہوتی ہیں، جنہیں اکثر و بیشتر سیاق و سباق سے بڑی بے رحمی کے ساتھ کاٹ کر سامانِ دلیل بنا لیا جاتا ہے۔

جب انہیں انکارِ ختمِ نبوت کی گنجائش پیدا کرنے کے لیے آیاتِ قرآنی تو درکنار احادیث و آثار کے ذخیرے سے بھی کوئی واضح اور مستند چیز ہاتھ نہیں آتی تو غیر مستند آثار اور مجروح الاسناد روایات میں سے ہی استدلال کے لیے کوئی سہارا ڈھونڈھنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ حدیث و روایت کے نام سے بھی کچھ نہ کچھ تو پیش کیا ہی جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں یہ لوگ عموماً وہ روایت پیش کرتے ہیں جس میں حضرت ابراہیم (حضورؐ کے فرزند) کے متعلق یہ الفاظ ملتے ہیں: لو عاش لکان صدیقاً نبیاً۔

ہم اس مضمون میں مذکورہ روایت کی اصل حقیقت سے بھی بحث کریں گے اور علاوہ ازیں قادیانیوں کی طرف سے پیش کیے جانے والے بعض اُن دوسرے دلائل کا بھی جائزہ لیں گے جو اقوال کی غلط توجیہات

اور بعض صورتوں میں عبارات کی کتر بیونت کی پیداوار ہوتے ہیں۔

سب سے پہلے "لو عاش . . . " کی مذکورہ روایت کو لیجیے۔ قادیانی اس روایت کو کسی شد و مد کے ساتھ پیش کرتے ہیں، اور پھر اس پر استدلال کا قلعہ کس طرح استوار کرتے ہیں، اس کا اندازہ قادیانیوں کے ایک تازہ پمفلٹ "ختمِ نبوت اور بزرگانِ امت" کے اس اقتباس سے ہو سکتا ہے:

"سرورِ کائنات بنفسِ نفیس آیت خاتم النبیین کے نزول کے پانچ سال بعد فرزندِ ارجمند حضرت ابراہیم کی وفات پر فرماتے ہیں "لو عاش لکان صدیقاً نبیاً" کہ اگر میرا بیٹا (ابراہیم) زندہ رہتا تو ضرور صدیق نبی بنتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے واضح ہے کہ اگر آپ خاتم النبیینؐ کا مطلب یہ سمجھتے کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا تو آپ فرماتے کہ اگر ابراہیم زندہ بھی رہتا تب بھی نبی نہ ہوتا، کیونکہ میں خاتم النبیین ہوں۔ گویا آیت خاتم النبیین صاحبزادہ ابراہیم کے نبی بننے میں روک نہ تھی، محض اُن کا وفات پا جانا اُن کے نبی بننے میں روک تھا[۲]۔"

("ختمِ نبوت اور بزرگانِ امت" صفحہ ۲)

لیکن دیکھنا یہ ہے کہ جن الفاظ (لو عاش . . . الخ) پر اس "پُرزور" استدلال کی بنیاد رکھی گئی ہے، کیا اُن الفاظ کا حدیث ہونا بھی ثابت ہے؟ اور کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ روایت سندِ صحیح کے ساتھ حضورؐ تک پہنچتی ہے؟ اس سوال کا جواب آپ کو ائمۂ حدیث کے اس فیصلے سے معلوم ہو جائے گا جو انہوں نے

---

[۱] کیا قادیانی فضلاء ہمیں سمجھائیں گے کہ حضورؐ نے اُس وقت خاتم النبیین کا کیا مطلب سمجھا تھا جب آپ نے حضرت عمرؓ کے متعلق فرمایا: لوکان بعدی نبیٌّ لکان عمر بن الخطاب (ترمذی) "اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمرؓ ہوتا"؟ اور اُس موقعہ پر حضورؐ کے ذہنِ مبارک میں خاتم النبیین کا کیا مفہوم تھا جب آپ نے حضرت علیؓ کو مخاطب کر کے فرمایا: انت منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ الا انہ لا نبی بعدی (بخاری و مسلم)۔ "میرے ساتھ تمہیں ایسی نسبت ہے جیسی حضرت ہارون کو حضرت موسیٰ کے ساتھ تھی، مگر ہاں: میرے بعد نبی کوئی نہیں ہوگا"؟

[۲] تو حضرت عمرؓ کے نبی بننے میں کون سی چیز "روک" تھی؟ (کوکب)

اس روایت کی سند کے بارے میں کیا ہے۔

امام قسطلانی جنہوں نے بخاری کی شرح لکھی ہے اپنی شرح بخاری میں اس روایت کے اسناد پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وعند ابن ماجۃ ... لماما ت ابراھیم ... قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: لوعاش لکان صدیقا نبیاً" وفی اسنادہ ابوشیبۃ ابراھیم بن عثمان الواسطی وھو ضعیف (بہ اختصار) (قسطلانی ج ۱۰ ص ۴۷۰ مطبوعہ مصر مطبع میمنیہ۔	اور ابن ماجہ کے ہاں یہ روایت ہے کہ حضورؐ نے اپنے فرزند ابراہیم کے انتقال پر" لوعاش لکان صدیقا نبیاً" فرمایا تھا۔ مگر اس روایت کی سند میں ابوشیبہ ابراہیم بن عثمان واسطی آتا ہے۔ اور وہ ضعیف ہے"۔

یہ زیر بحث روایت جن راویوں کے ذریعے سے نقل ہوئی ہے اُن کا مکمل سلسلۂ سند یہ ہے:

حدثنا عبدالقدوس ابن محمد، ثنا داؤد بن شبیب الباھلی، ثنا ابراھیم بن عثمان، ثنا حکم بن عتیبۃ، عن مقسم، عن ابن عباس ... (ابن ماجہ الجنائز)	ابن ماجہ نے عبدالقدوس بن محمد سے روایت کی۔ عبدالقدوس نے داؤدؒ بن شبیب باہلی سے۔ داؤد نے ابراہیمؒ بن عثمان سے۔ ابراہیم نے حکمؒ بن عتیبہ سے۔ حکم نے مقسمؒ سے۔ اور مقسم نے عبداللہ بن عباسؓ سے۔

اس سلسلۂ رُواۃ میں تیسرے نمبر پر ابراہیم بن عثمان (کنیت: ابوشیبہ) واقع ہے۔ جس کے متعلق امام قسطلانی کی رائے اُوپر بیان ہو چکی ہے۔

امام ابوعیسیٰ ترمذی، جن کی سننِ ترمذی حدیث کی صحاح ستہ میں شامل ہے، اسی راوی کے متعلق اپنا فیصلہ اِن الفاظ میں دیتے ہیں:

حدیث ابنِ عباسٍ حدیثٌ لیس اسنادہ بذالک القوی. ابراھیم بن عثمان ھو ابوشیبۃ الواسطی منکر الحدیث	"ابن عباس والی حدیث کا یہ اسناد قوی نہیں۔ یہ ابراہیم بن عثمان وہی ابوشیبہ واسطی ہے جس کی روایت قابلِ قبول نہیں ہوتی"۔

(ترمذی ص ۱۴۲۔ الجنائز)

تقریب التہذیب میں اس راوی کو متروک الحدیث قرار دیا گیا ہے:

ابراهیم بن عثمان ... ابو شیبة ... مشهورٌ بکنیته متروك الحدیث

”ابراہیم بن عثمان، ابوشیبہ اپنی کنیت کے ساتھ مشہور تھا۔ اس کی روایت رد کردی جاتی ہے۔“

(تقریب التہذیب ص۲۵ نولکشور)

پھر تہذیب التہذیب میں تو اس راوی کے بارے میں تقریباً تمام معروف ائمہ حدیث کی آراء درج کردی گئی ہیں:

ابراهیم بن عثمان ... قال احمد و یحیی و ابو داؤد ضعیفٌ وقال یحیی ایضًا لیس بثقة وقال البخاری سکتوا عنه وقال الترمذی منکر الحدیث وقال النسائی والدولابی متروك الحدیث وقال ابو حاتم ضعیفُ الحدیث سکتوا عنه وترکوا حدیثه وقال الجوزجانی ساقط وقال صالح جزرة، ضعیف لا یکتب حدیثه روی عن الحکم احادیث مناکیر وقال معاذ بن معاذ العنبری، کتبتُ الی شعبة وهو ببغداد اسأله عن ابی شیبة القاضی أروی عنه؟ فکتب الیّ لا ترو عنه فانه رجلٌ مذموم۔

(تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۱۴۴، ۱۴۵) طبع حیدرآباد دکن

ابراہیم بن عثمان .... امام احمد، یحییٰ اور ابوداؤد نے کہا ”ضعیف ہے اور یحییٰ نے تو اسے غیر ثقہ بھی قرار دیا ہے۔ امام بخاری نے کہا ”اس کے بارے میں محدثین سکوت اختیار کرتے ہیں (یعنی قابلِ اعتماد نہیں سمجھتے) ترمذی نے منکر الحدیث کہا ہے۔ نسائی اور دولابی نے متروک الحدیث (جس کی روایت چھوڑ دی جاتی ہے) کہا ہے۔ ابوحاتم نے ضعیف الحدیث کہا، اور بتایا ہے کہ علمائے حدیث اس کے بارے میں سکوت کرتے ہیں، اور اس کی روایت چھوڑ دیتے ہیں۔ جوزجانی نے کہا ساقطُ الاعتبار ہے۔ صالح جزرہ نے کہا ”ضعیف ہے، اس کی روایت لکھی نہیں جاتی۔ اس نے حکم سے ناقابلِ قبول روایتیں نقل کی ہیں۔ معاذ عنبری نے کہا ”میں نے بغداد خط لکھ کر شعبہ سے پوچھا کہ میں

ابوشیبہ قاضی سے روایت کیا کروں ؟ انہوں نے
جواب دیا "نہیں اس سے روایت نہ کرنا ، یہ ناپسندیدہ
شخص ہے "

معلوم ہوا امام احمد، یحییٰ ، ابوداؤد ، امام بخاری ، ترمذی ، دولابی ، ابوحاتم جوزجانی ، صالح جزرہ ، معاذ عنبری اور شعبہ جیسے علماء حدیث نے ابوشیبہ ابراہیم کو قابلِ قبول قرار نہیں دیا۔ حیرت ہے کہ ان ائمہ کی تصریحات کے باوجود راویٔ مذکور کی روایت کو بنائے استدلال بنایا جاتا ہے۔ اور اس واضح جرح و قدح کی طرف کوئی اشارہ تک نہیں کیا جاتا جو اس راوی اور اس کی اس زیرِ بحث روایت پر، علم حدیث اور فنِ رجال کی مستند کتابوں میں محفوظ ہے۔

پھر لُطف یہ ہے کہ جس ابنِ ماجہ سے مذکورہ روایت نقل کی گئی ہے۔ اس کے اسی صفحے کے حاشیے پر اس روایت اور راوی کا ضعف پوری وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔ ابن ماجہ کا امام ابوالحسن سندی کے حواشی والا ایڈیشن ۱۳۱۳ھ میں شائع ہوا تھا۔ اور قادیانیوں کے اس پمفلٹ میں اسی ایڈیشن کے صفحہ ۲۳۷ کے حوالہ سے مذکورہ روایت نقل کی گئی ہے۔ اور اسی صفحہ ۲۳۷ کے حاشیے پر یہ عبارت صاف طور پر موجود ہے :

فی اسنادہ ابراھیم بن عثمان ابوشیبة قاضی واسط قال فیه البخاری سکتوا عنه وقال ابن المبارك ارمِ به وقال ابن معین لیس بثقةٍ ، وقال احمد منکر الحدیث وقال النسائی متروك الحدیث ۔ (ابن ماجہ ج ۱ ص ۲۳۷ ، حاشیہ کی سطر ۲۹ و ۳۰)	اس روایت کی سند میں ابراہیم بن عثمان ، ابوشیبہ قاضی واسط واقع ہے جس کے بارے میں امام بخاری نے کہا : محدثین اس شخص کے متعلق سکوت کر جاتے ہیں (یعنی ناقابلِ قبول ہے) ، ابن مبارک نے کہا : اس شخص کو رد کر دو۔ ابنِ معین نے کہا : "یہ ثقہ نہیں ہے "۔ امام احمد نے کہا : "اس کی روایت مانی نہیں جاتی " اور امام نسائی نے فرمایا " اس کی روایت ترک کر دی جاتی ہے "۔

اب آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ آیا یہ تحقیق کا کمال ہے ؟ یا دیانتداری کا ؟ کہ قادیانی مضمون نگاروں کو، ایک کتاب کے ایک صفحے پر درج ہونے والی ایک روایت تو دکھائی دیتی ہے، مگر اسی صفحہ پر اس روایت کے متعلق جو تنقیدی نوٹ لکھا گیا ہے وہ ان کے نوٹس میں نہیں آتا۔

سنن ابن ماجہ کا ایک نیا ایڈیشن مصر سے ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا تھا جسے محمد فؤاد عبدالباقی نے مرتب کیا تھا۔ اس نے احادیث پر نقد و تخریج کا کام بڑی محنت سے کیا ہے۔ اس نے بھی مذکورہ روایت کے ماتحت اوپر والے تنقیدی نوٹ کو لفظاً بلفظ نقل کیا ہے۔ دیکھیے ابن ماجہ مطبوعہ مصر ص ۴۸۴، ج ۱۔

اس روایت کی سند کے حق میں بڑی سے بڑی تائید ملا علی قاری کی پیش کی جا سکتی ہے کہ انہوں نے اس روایت کو صحیح مانا ہے۔ لیکن یہاں دو باتیں مدنظر رکھنی ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ ملا علی قاری نے دیگر ائمہ حدیث کی آرار پہلے بیان کر دی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے بتلایا ہے کہ نووی اور ابن عبدالبر جیسے عظیم امام اس روایت کو صحیح تسلیم نہیں کرتے۔ اور اس کے بعد اپنی ذاتی رائے بیان کی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر ایک ملا علی قاری اس روایت کے حق میں رائے دیتے ہیں۔ اور کوئی شخص اُن کی اس رائے کو باقی تمام ائمہ حدیث کے فیصلے پر ترجیح دینا چاہتا ہے تو کم از کم اُسے اِس روایت کا وہ مطلب اور منشا بھی پیش نظر رکھنا چاہیے جو ملا علی قاری نے اس روایت کی تشریح میں بیان کیا ہے۔ ملا علی قاری اس روایت کو اپنی کتاب "موضوعات" میں درج کرنے کے بعد جہاں اس کے ضعفِ اسناد سے بحث کرتے ہیں وہاں اس کی معنوی تشریح بھی ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:

ویشیر الیہ قولہ تعالیٰ مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ، فانہ یومی الیہ بانہ لم یعش لہ ولد الی مبلغ الرجال فان ولدہ من صلبہ یقتضی ان یکون لب قلبہ کما یقال الولد سر ابیہ ولو عاش

"اور اسی (روایت) کی طرف یہ فرمانِ ربانی بھی اشارہ کرتا ہے ما کان محمد ابا احد من رجالکم و لکن رسول اللہ وخاتم النبیین۔ پس اشارہ یہ ہے کہ حضورؐ کی اولادِ نرینہ اس لیے زندہ نہ رہی کیونکہ آپ کا صلبی بیٹا زندہ رہنے کی شکل میں عقل کا تقاضا یہ ہوتا کہ وہ آپ کا مکمل پرتو بنے۔ جیسے کہا جاتا ہے

وبلغ اربعین وصار نبیاً لزم ان لا یکون نبیّنا خاتم النبیین۔ (موضوعات کبیر ص ۹۹۔۱۰۰)	بیٹا اپنے باپ کے مانند ہوتا ہے۔ اور بالفرض اگر بیٹا زندہ رہتا، اور چالیس سال کی عمر کو پہنچکر نبی بنتا تو لازم آتا کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین نہ ہوں۔

ہماری اوپر کی گفتگو سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ " لو عاش لکان صدیقا نبیاً کی روایت ائمۂ حدیث کے فیصلے کے مطابق قطعاً ناقابلِ قبول ہے۔ اور اگر ایک ملا علی قاری سے اس کی صحت کا قول منقول ہوا ہے تو اُن کے نزدیک بھی اس روایت میں اُس مفہوم کی کوئی گنجائش نہیں جو قادیانی حضرات اس سے نکالنا چاہتے ہیں۔ بلکہ اس کے برعکس ملا علی قاری کی عبارتِ بالا کے مطابق یہ روایت بھی ختمِ نبوت کے اُسی اعتقاد کی تائید کرتی ہے جو ساری اُمت میں مسلّم اور متفق علیہ چلا آیا ہے۔

مُلّا علی قاری کی عبارت

ملا علی قاری علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب "موضوعاتِ کبیر" میں روایت " لو عاش لکان صدیقاً نبیاً " پر ایک طویل اور مفصل بحث لکھی ہے۔ جس کا کچھ اقتباس سطورِ بالا میں گذر چکا ہے۔ اس طویل مبحث میں ملا علی قاری نے اصل مسئلہ کے متعلق جو باتیں بڑی وضاحت کے ساتھ کہی ہیں، جن سے خود ملا علی قاری کے عقیدۂ ختمِ نبوت پر روشنی پڑتی ہے، اُن سب کو نظر انداز کرتے ہوئے قادیانی حضرات نے اپنے اس پمفلٹ میں صرف بحث کے آخر سے چند سطریں اٹھالی ہیں، اور انہیں حسبِ ذیل اُردو ترجمے کا لباس پہنا کر، اپنے دلائل کی صف میں کھڑا کر دیا ہے:

" یعنی اگر صاحبزادہ ابراہیم زندہ رہتے اور نبی ہو جاتے۔ اور اسی طرح حضرتِ عمر نبی بن جاتے۔ تو آں حضرت کے تبع یا اُمتی نبی ہوتے "۔ ۔ ۔ الخ

یہاں پہلی بات یہ ہے کہ عربی عبارت کے ترجمے اور اقتباس میں ایک طرح کا ناجائز تصرّف کیا گیا ہے مثلاً " یعنی " کا لفظ یا اس کے مفہوم کو ادا کرنے والا کوئی لفظ اصل عبارت میں نہیں ہے۔ اُردو ترجمے میں

یہ لفظ مترجم نے اپنی طرف سے بڑھا دیا ہے۔ اصل عربی عبارت یوں ہے:

قلتُ ومع ھٰذا لو عاش ابراھیم... "میں اس اوپر والی گفتگو کے ساتھ یہ بھی کہتا ہوں کہ اگر بالفرض ابراہیم زندہ رہتے"... الخ

.... الخ (موضوعاتِ کبیر ص۵۸)

سوال یہ ہے کہ اس عبارت میں سے کس لفظ کا ترجمہ "یعنی" کیا گیا ہے؟ "یعنی" کا اضافہ کر کے عبارت کی حیثیت کو بدلنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو عبارت کلمۂ "یعنی" سے شروع ہو رہی ہو اُس کے بارے میں یہی سمجھا جاتا ہے کہ یہ کسی کلام کے لیے تشریحی عبارت کی حیثیت رکھتی ہو گی۔ لیکن مذکورہ عبارت تشریحی حیثیت ہرگز نہیں رکھتی۔ اس کی حیثیت محض ایک عقلی احتمال کی ہے جسے مُؤلف نے لفظ "لَوْ" (بالفرض) سے بیان کیا ہے۔ اس لیے اس عبارت میں "یعنی" کا کلمہ داخل کرنا یقیناً صریح زیادتی ہے۔

پھر "وَمَعَ ھٰذا" (اور اس کے باوجود، مزید برآں) کے الفاظ کا ترجمہ چھوڑ جانا، عبارت کی حیثیت کے متعلق غلط تاثر دینے کے لیے ایک اور ناجائز تصرّف ہے۔ کیونکہ کسی عبارت کے آغاز پر اس نوعیت کے الفاظ یہ پتہ دیتے ہیں کہ اصلِ بحث اوپر گزر چکی ہے، اور اب اختتامِ مبحث پر ایک ضمنی احتمال کا مزید ذکر کیا جا رہا ہے ___ لہٰذا زیرِ بحث عبارت کے متعلق علمی دیانت کا تقاضا یہ تھا کہ یا تو اقتباس اُوپر کے کسی ایسے مقام سے شروع کیا جاتا، جہاں سے اصلِ مبحث کی ٹھیک نشاندہی ہو جاتی۔ اور یا پھر کم از کم عبارت کے سیاق و سباق کی روشنی میں اوپر کے مبحث کا لُبِّ لباب اس حد تک تو بیان کر دیا جاتا کہ جس سے مُولّف کا اصل مدعا سمجھنے میں غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان نہ رہتا۔ اس ٹکڑے کو یُوں کاٹ کر درج کرنے سے جو غلط فہمی پیدا ہوتی ہے، اس کا اندازہ تبھی ہو سکتا ہے جبکہ اس بحث کی عبارت کو ذرا اُوپر سے پڑھا جائے۔ اس لیے یہ عبارت دوبارہ پیش کی جاتی ہے:

ویشیر الیہ قولہ تعٰ مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ فانّہٗ یومی الیہ بانّہ لم یعش لہٗ ولدٌ الی مبلغ الرّجال، فانّ ولدہٗ	اور اسی روایت (لو عاش...) کی طرف یہ فرمانِ ربانی بھی اشارہ کرتا ہے: "ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین" پس اس کا اشارہ یہ ہے کہ حضورؐ کی اولادِ نرینہ

من صُلبه یقتضی ان یکون من لب قلبه کما یقال الولد سِرّ ابیه ولو عاش وبلغ اربعین وصار نبیًّا لزم ان لایکون نبیُّنا خاتم النبیین . . . .

(موضوعاتِ کبیر)

اس لیے زندہ نہ رہی، کیونکہ آپ کا صُلبی بیٹا زندہ رہنے کی صورت میں عقل کا تقاضا یہ تھا کہ وہ آپ کا پرتو بنتا جیسے کہا جاتا ہے بیٹا اپنے باپ پر جاتا ہے۔ اور اگر بیٹا زندہ رہ کر چالیس برس کی عمر کو پہنچتا اور نبی ہوتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلّم خاتم النبیین نہ رہتے"۔ ...

یہاں ملّا علی قاری نے روایت کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ چونکہ ہمارے حضورؐ خاتم النبیین تھے اس لیے آپ کے فرزند حضرت ابراہیم انتقال فرما گئے۔ کیونکہ اگر وہ زندہ رہ کر چالیس برس کی عمر تک پہنچتے تو ہونا یہ چاہیے تھا کہ بیٹا باپ کا عکس بنتا۔ لہٰذا انہیں نبی ہونا چاہیے تھا۔ لیکن اس صورت میں حضورؐ خاتم النبیین نہ رہتے۔ اس لیے مشیّت کا فیصلہ یہ تھا کہ ابراہیم چھوٹی عمر میں ہی انتقال فرما جائیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملّا علی قاری بھی خاتم النبیین کا وہی مفہوم سمجھتے ہیں جو باقی تمام اُمّت نے سمجھا ہے۔ اب یہ عبارت جو ہم نے اوپر پیش کی ہے اُس عبارت سے صرف دو تین سطریں پہلے واقع ہے جسے قادیانی پیش کرتے ہیں۔ مگر وہ اس عبارت کو یک قلم نظر انداز کر جاتے ہیں اور آخر بحث سے ایک ضمنی احتمال والی عبارت کو لیکر شوقِ استدلال پُورا کر لیتے ہیں۔

علاوہ ازیں یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ ملّا علی قاری کی یہ ضمنی گفتگو بھی محض اس بنیاد پر ہے کہ وہ لو عاش . . . کی روایت کو صحیح سمجھ کر اس کی توجیہ بیان کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ جمہور ائمۂ حدیث نے اس روایت کو ناقابلِ قبول قرار دیا ہے! اور جس راوی کے ذریعے سے یہ روایت نقل ہوئی ہے اُسے علماءِ حدیث نے غیر ثقہ، منکر الحدیث اور "رجل مذموم" تک کہا ہے۔ لہٰذا جب اصلِ روایت کا وجود ہی ثابت نہیں ہوتا تو پھر اس کی توجیہ و توضیح کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے اس لیے علمی اور اصُولی لحاظ سے دیکھا جائے تو ملّا علی قاری علیہ الرحمہ کی محولہ بالا عبارت سے کوئی ادنیٰ نوعیت کا استدلال بھی نہیں کرنا چاہیے، چہ جائیکہ ختمِ نبوت جیسے اہم اعتقادی اور بنیادی مسئلے میں اس جیسی عبارت کو دلیل بنایا جائے۔

حبش اور مسلمانوں کے تعلقات

عمر فاروق مودودی

(۴)

۱۹۱۳ء میں مینلک کی موت کے ساتھ حالات نے ایک مرتبہ پھر پلٹا کھایا اور حبشہ میں اسلام کی جو شمع بجھنے کو تھی قدرت نے اس کے روشن رہنے کا سامان کر دیا۔ تخت پر مینلک کا پوتا لیج ایاسو بیٹھا جسے اس نے اپنی زندگی میں (۱۹۰۸ء) اپنا جانشین نامزد کر دیا تھا۔ یہ بادشاہ مسلمانوں سے بڑھ کر مسلمان تھا اس نے مسیحیت کا انکار کر دیا اور اس نظریے کا بھی انکار کر دیا جس کی بنیاد پر اس کا خاندان صدیوں سے حبشہ پر حکومت کرتا آ رہا تھا یعنی یہ کہ وہ لوگ سلیمان علیہ السلام اور ملکہ سبا کی اولاد ہیں۔ بلکہ اس کے مقابلے میں اس نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد سے ہے۔ اس نے بعض مسلمان فقراء سے فرمائش کی کہ وہ اس کے لیے عربی نسب نامہ لکھیں۔ اس نے مسلمان عورتوں سے نکاح کیے اور اس طرح باقاعدہ مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہو گیا۔ مساجد میں جا کر عبادتیں کرتا تھا۔ اولیاء کے مزارات پر حاضریاں دیتا تھا۔ کلیسا میں کبھی نہیں جاتا تھا۔ اپنا روایتی لباس ترک کر کے مسلمانوں کا لباس اختیار کر لیا تھا۔ انہی کی طرح چادر اور عمامہ باندھتا تھا اور عربی طرز کی تلوار حمائل کرتا تھا۔

یہ تو وہ افعال تھے جو اس کی نجی زندگی اور ذاتی معاملات سے تعلق رکھتے تھے۔ کاروبارِ مملکت میں بھی وہ اسلام کا ایک سچا فدائی تھا۔ اس نے ایک مسجد بنائی۔ زمانۂ سابق میں ظالم بادشاہوں نے جن مسلمانوں سے ان کے مکان چھین کر عیسائیوں کے حوالے کر دیئے تھے، اس نے انہیں ان کے مکان پھر واپس دلوا دیئے۔ اپنے انجام سے بے پروا ہو کر اس نے پرچم پر حبشی حروف میں "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کے الفاظ لکھوائے تھے۔ جلا کے قبائل نے جن میں اکثر مسلمان تھے جب بغاوت کی تو اس نے ان کے خلاف فوج بھیجنے سے انکار کر دیا۔ اور اس کے مقابلے میں بلادِ سومال کے "دیوانے ملا" کی جو اسے اپنا برادرِ عم زاد کہتا تھا

پوری پوری مدد کی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے مسلمان ریاستوں کا ایک وفاق بنانے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں بلادِ سومال کے مسلمانوں سے باقاعدہ مدد طلب کی۔

لیج ایاسو کی اسلام کے ساتھ والہانہ عقیدت و شیفتگی، مسلمان نوازی اور یورپ کی استعماری طاقتوں کے ساتھ اس کا غیر فدویانہ طرزِ عمل حبشہ کے مسیحی عناصر اور یورپ کی استعماری طاقتوں کو ایک آنکھ نہ بھایا۔ چنانچہ ستمبر ۱۹۱۶ء میں حبشی کلیسا کے سربراہ نے اس کا مکمل مقاطعہ کر دیا اور امہرہ[1] قبیلے کے سرداروں کو اس کی وفاداری کے عہد سے بری الذمہ قرار دے دیا۔ اس طرح رسمی طور پر اسے تخت سے معزول کر دیا اور اس کی جگہ منیلک کی بیٹی زودیتو کو ملکہ اور منیلک کے بھتیجے کے بیٹے جازماش تفاری کو ریجنٹ، وارث تخت اور سرداروں کا سردار نامزد کر دیا۔

لیج ایاسو نے کمزوری اور بزدلی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اس کا باپ رأس میکائیل جو وولو اور گالا کا سردار تھا اس کی مدد کے لیے گالا فوجیں لے کر پہنچ گیا۔ ۲۶ اکتوبر ۱۹۱۶ء کو ساگال کے مقام پر لیج ایاسو کی فوجوں اور امہرہ قبیلے اور یورپ کی استعماری طاقتوں کی متحدہ فوجوں کے درمیان ایک سخت خونریز معرکہ ہوا لیکن امہرہ قبیلے، انگلینڈ، فرانس اور اٹلی کی متحدہ قوت کے سامنے لیج ایاسو کی کچھ پیش نہ جا سکی۔ اس کا باپ رأس میکائیل گرفتار ہو گیا اور وہ خود جان بچا کر نکل گیا۔ مگر آخر کار ۱۹۲۱ء میں رأس تفاری نے اسے گرفتار کر لیا اور پابہ زنجیر قید کر دیا۔ پھر ۱۹۳۵ء میں زہر دے کر اس کا خاتمہ کر دیا۔

۱۹۱۶ء میں لیج ایاسو کی معزولی کے ساتھ سکھ کی وہ چند گھڑیاں ختم ہو گئیں جو اس کی تخت نشینی کے ساتھ مسلمانوں کو نصیب ہوئی تھیں۔ تاہم فوراً ہی کوئی مصیبت نازل نہیں ہوئی کیونکہ ملکہ زودیتو اور ولی عہد رأس تفاری کے درمیان اقتدار کی کشاکش شروع ہو گئی اور آپس کی اس کشاکش کے طفیل مسلمان محفوظ رہے۔

رأس تفاری برابر اپنے اثرات بڑھاتا چلا گیا یہاں تک کہ ۱۹۲۸ء میں وہ اس قدر طاقتور ہو گیا کہ اس نے بوڑھی ملکہ زودیتو پر دباؤ ڈال کر اسے مجبور کر دیا کہ وہ اسے شوا کے صوبے کے

[1] حبشہ کا شاہی خاندان امہرہ قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے۔ سلطنت کی تمام کلیدی اسامیاں صرف امہرہ سرداروں کو دی جاتی ہیں۔

نگس (بادشاہ) کا خطاب دے دے۔ دو سال کی مزید تگ و دو کے بعد راس تفاری نے ملکہ کو زہر دے کر اپنے راستے سے ہٹا دیا اور ۲ نومبر ۱۹۳۰ء کو ہیل سلاسی کے لقب کے ساتھ حبشہ کے تخت پر بیٹھ گیا۔

ہیل سلاسی نے زمامِ اقتدار سنبھالنے کے بعد ملک کو جدید جمہوری رنگ دینے کے لیے آئین و پارلیمان کے ڈھونگ رچائے لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ اس کے اپنے اقتدار پر کوئی آنچ نہ آنے پائے۔ آئین کے جمہوری ہونے کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ نظرثانی شدہ آئین کی، جو ۴ نومبر ۱۹۵۵ء کو نافذ کیا گیا ایک سو اکتیس دفعات میں سے اٹھاون دفعات مکمل طور پر بادشاہ، اس کے اختیارات، اس کے عقائد اور اس کے خاندان کے متعلق ہیں۔ آئین کی دفعہ ۲۶ کے مطابق بادشاہ اپنی سلطنت کے ہر معاملے میں اعلیٰ ترین اختیارات کا حامل ہے۔ دفعات ۲۷ اور ۳۶ کی رُو سے بادشاہ کو وزراء اور صدور بلدیات کے تقرر، کسی ملک کے ساتھ جنگ یا اندرونِ ملک ہنگامی حالات کے اعلان، امور خارجہ پر مکمل کنٹرول، معاہدات کی منظوری، سکّے ڈھالنے، کرنسی نوٹ چھاپنے اور ملک کے دفاع اور سالمیت کے لیے ہر وہ قدم اٹھانے کے اختیارات حاصل ہیں جو ضروری سمجھا جائے۔ دفعہ ۸۸ کی رُو سے پارلیمان کا کوئی مجوزہ قانون اس وقت باقاعدہ قانون کی شکل اختیار کرے گا جب بادشاہ اس کی منظوری دے گا لیکن اگر بادشاہ اس کی منظوری نہ دے تو وہ مجوزہ قانون کالعدم ہوگا اور بادشاہ کے ویٹو کے علی الرغم ہرگز پاس نہیں ہو سکتا۔

اس آئین کو دیکھتے ہوئے پارلیمان کی حقیقت کے بارے میں کوئی خوش فہمی باقی نہیں رہ سکتی۔ دنیا کے ان تمام ملکوں کی طرح جہاں کسی نہ کسی شکل میں آمریت کا دَور دورہ ہے، حبشہ کی پارلیمان میں بھی حزبِ اختلاف کا وجود عنقا ہے۔ چند ارکان پارلیمان جو ایک مرتبہ اختلاف اور تنقید کا جرم کر بیٹھے تھے، بادشاہ کے حکم سے ان کی رکنیت منسوخ کر دی گئی۔ ایک اور رُکن پارلیمان نے جو بڑے اثر و رسوخ کا مالک تھا جب پارلیمان میں حکومت سے حزبِ اختلاف منظم کرنے کی اجازت چاہنے کی جرأت کی تو پولیس اسے پارلیمنٹ ہاؤس سے گرفتار کر کے جیل لے گئی۔ ملک کی سیاسی صورت حال

پر ایتھیوپیا ٹو ڈے میں مسٹر ارنسٹ ڈبلیو لوتھر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"یہ ملک کی انتہائی بدنصیبی ہے کہ شاہ اور شاہی اختیارات کی آمیزش حکومت کے ادنیٰ درجے کے نظم ونسق پر بھی اپنی انتہائی مضبوط گرفت رکھتی ہے۔ اس آمیزش، اور شاہی لطف وکرم کے ذریعے ترقی کرنے کی جو حوصلہ افزائی یہ آمیزش کرتی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ حبشی گورنمنٹ کے افسروں کا، وزراء سے لے کر ادنیٰ سرکاری ملازمین تک، ایک سب سے زیادہ اہم کام ایک طرف اپنی پوزیشن کی حفاظت اور دوسری طرف سازباز اور الزام تراشی کے ذریعے دوسروں کی جڑیں کاٹتے رہنا ہے۔ ماتحت عملہ ہر وقت افسرانِ بالا کی ناخوشی کے خوف کے زیر اثر رہتا ہے۔ جب تک حبشہ میں شاہی مطلق العنانیت اس طرح سرایت کیے رہے گی اس وقت تک وہاں کسی ذمہ دار حکومت کے پنپنے کی امید نہیں کی جا سکتی۔ نظرثانی شدہ دستور کے باوجود پارلیمان غیر مؤثر اور عدلیہ کی آزادی فریب نظر رہے گی۔ شہری حقوق کی تنفیذ اور سیاسی امور میں اظہارِ رائے کی آزادی مستقبل کی موہوم امیدیں ہی رہیں گی۔"

دراصل اس وقت دو ادارے ملک پر چھائے ہوئے ہیں۔ ایک بادشاہ اور اس کا قبیلہ اور دوسرے ایتھیوپین آرتھوڈاکس چرچ۔ چونکہ دونوں کے مفاد کا تقاضا یہ ہے کہ ہر ایک دوسرے کی پشت پناہی کرے اس وجہ سے نئے دستور کی دفعہ ۱۲۶ میں مسیحیت کو سرکاری مذہب قرار دینے کے بعد یہ الفاظ لکھے گئے ہیں کہ "بادشاہ ہمیشہ ایتھیوپین آرتھوڈاکس عقیدے کا اقرار کرے گا۔" اس طرح بادشاہ کو آرتھوڈاکس چرچ کا پابند بنانے کے بعد بادشاہ کو چرچ کا رکنِ اعلیٰ بنانے کے لیے اس دفعہ میں کہا گیا ہے کہ "تمام مذہبی مراسم میں بادشاہ کا نام لازماً لیا جائے گا۔" ملک پر دونوں ادارے بادشاہ اور چرچ، جس طرح بیک وقت حکمراں ہیں اس کی ادنیٰ مثال یہ ہے کہ مزارعین ہر فصل کے چار حصے کرتے ہیں۔ ایک حصہ تو زمین کے مالک کے پاس چلا جاتا ہے۔ دوسرا حصہ حکومت مالگذاری کے طور پر وصول کر لیتی ہے۔ تیسرا حصہ چرچ عشر کے طور پر وصول کر لیتا ہے اور چوتھا حصہ ان کے اپنے لیے بچتا ہے۔

ملک کی سیاسی صورتِ حال کے متعلق اب تک جو کچھ ہم نے بتایا ہے۔ اس سے مسلمان باشندوں کے بارے میں کسی خوش فہمی کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اس شکارگاہ میں جو شکار سب سے زیادہ افراط کے ساتھ اور بغیر ادنیٰ سی کوشش کے شکاریوں کو مل جاتا ہے وہ یہی بے کس مسلمان باشندے ہیں۔ چونکہ اب تک ملک میں باقاعدہ مردم شماری کبھی نہیں کرائی گئی اس لیے ملک کی کل آبادی کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ تاہم حبشی حکومت نے ۱۹۶۰ء میں جو اعلان کیا تھا اس کے مطابق ملک کی کل آبادی دو کروڑ ہے جس میں ستر فی صد بت پرست قبائل ہیں۔ باقی ماندہ آبادی میں حکومت کے محکمہ اطلاعات کے اپنے شائع کردہ پمفلٹ (۱۹۵۱ء) کے مطابق مسلمانوں اور عیسائیوں کی تعداد برابر ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ ملک میں اس وقت تراسی لاکھ مسلمان موجود ہیں۔

مسلمان باشندوں کی اتنی بڑی تعداد کو جس طرح نظر انداز کیا گیا ہے، اس کا اندازہ مندرجہ ذیل حقائق سے کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ سولہ وزراء کی کابینہ میں ایک مسلمان وزیر بھی نہیں ہے۔

۲۔ اعلیٰ سرکاری افسروں میں ایک مسلمان افسر بھی نہیں ہے۔

۳۔ بارہ صوبائی گورنروں میں سے ایک مسلمان گورنر بھی نہیں ہے۔

۴۔ گیارہ سو بیس اضلاع کے ایڈمنسٹریٹروں میں سے کل سات فی صد ایڈمنسٹریٹر مسلمان ہیں۔

۵۔ ادنیٰ سرکاری ملازمین میں مسلمانوں کی تعداد دو فی صد ہے۔

معاملہ اگر صرف نظر انداز کیے جانے تک ہی محدود رہتا تو بسا غنیمت تھا۔ لیکن وہاں تو حالت یہ ہے کہ اسلام کے خلاف صلیبی جنگ کو قانونی حیثیت دی گئی ہے۔ حبشہ کا بادشاہ اگرچہ آئین کی رو سے مقدس صلیب کا محافظ ہے لیکن عملی طور پر اسلام کے خلاف جارح بھی ہے۔ چنانچہ شاہ ہیل سلاسی نے اپنی مملکت میں اسلامی تہذیب کے تمام مراکز اور تمام اسلامی مدرسے بند کر دیے ہیں عربی زبان کا پڑھنا پڑھانا ممنوع قرار دے دیا گیا ہے۔ مسلم علاقوں کے چاروں طرف ایک آہنی پردہ قائم کر دیا گیا ہے تاکہ مسلمان باشندے بیرونی دنیا کے اسلامی اداروں سے بالکل کٹے رہیں۔ حبشی مسلمانوں کو دوسرے اسلامی ملکوں میں

تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اسی طرح دوسرے اسلامی ملکوں کے علماء کو بھی حبشہ کے مسلم علاقے میں جانے کی قطعاً اجازت نہیں دی جاتی۔ ۱۹۵۱ء میں جامعہ ازہر کے علماء کا ایک وفد حبشہ میں مسلمان باشندوں کی تعلیمی حیثیت کا جائزہ لینے کے لیے ادیس ابابا پہنچا لیکن پہنچتے ہی اسے چند گھنٹوں کے نوٹس پر ملک سے نکل جانے کا حکم دیا گیا۔ مدینہ یونیورسٹی میں حبشہ کے مسلمان طلبہ کے لیے چند نشستیں محفوظ کی گئیں اور حبشہ کی حکومت سے مسلمان طلبہ بھیجنے کی درخواست کی گئی۔ لیکن حبشہ کی حکومت نے مسلمان طلبہ کو جانے کی اجازت نہ دی اور یونیورسٹی کو مطلع کر دیا کہ وہ اپنی مسلمان رعایا کو مدینہ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔

دینی تعلیم سے تو مسلمان باشندوں کو بے بہرہ رکھنے کی یوں کوشش کی جا رہی ہے اور دنیوی تعلیم سے انہیں محروم رکھنے کی کوششوں کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۵۹ء کے اعداد و شمار کے مطابق ملک میں عیسائی طلبہ کی تعداد چودہ لاکھ ہے جبکہ مسلمان طلبہ کی تعداد کل دو ہزار۔ مزید براں کسی بھی مسلم علاقے میں اس وقت تک اسکول نہیں کھولا جاتا جب تک کہ وہاں تھوڑی بہت عیسائی آبادی نہ ہو۔ اس پر بھی یہ اطمینان کر لیا جاتا ہے کہ عیسائی آبادی میں ایسے بچے کافی تعداد میں موجود ہیں یا نہیں جو اسکول جانے کے قابل ہوں۔

صلیب کی حفاظت کا حق اس وقت تک ادا نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ ہر اس شخص کو جبر و تشدد کا نشانہ نہ بنایا جائے جو صلیب کے آگے جھکنے کو تیار نہ ہو۔ چنانچہ حبشہ کے مسلم علاقے بورانہ کے ضلع بابو میں کرنل اَصَفا و الدجیبر زادرجا میں ڈی جازماش میسفن سلاسی[1] کی سرگرمیاں اس امر کی زندہ شہادت ہیں۔

---

[1] یہ حضرت ایک ان پڑھ اجڈ سپاہی ہیں۔ گورنری کے عہدے پر ان کے تقرر کا باعث ان کی جسمانی قوت ہے جو جہاں پناہ ہیل سلاسی کو بھا گئی ہے۔ بے گناہ مسلمانوں کو پابہ زنجیر بر سرِ عام کوڑے لگوانا ان حضرت کا محبوب مشغلہ ہے۔ مقدس صلیب کی حفاظت کا فرض یہ حضرت یوں ادا فرماتے ہیں کہ مسلمان زمینداروں کی زمینیں ضبط کر کے ان میں انہیں سے جبراً مریم عذراء کے کلیسا تعمیر کرواتے ہیں۔

گوج کے بت پرست قبیلے کے سردار کو اپنے قبیلے سمیت مسلمان ہو جانے کے جرم میں جیل بھیج دیا گیا اور اس وقت تک جبر و تشدد کا نشانہ بنایا گیا جب تک کہ اس نے عیسائیت قبول نہ کرلی۔ گوٹی کے مسلمان قبیلے کے سلطان جراد ابراہیم سیو کو اسی مقدس مقصد کی خاطر سات ماہ تک مسلسل جسمانی اذیت پہنچائی گئی لیکن خوش نصیب سلطان اپنا ایمان سلامت لے کر سومالیہ فرار ہو جانے میں کامیاب ہو گیا۔ البتہ ایسے بدنصیب مسلمانوں کی تعداد بہت ہے جو سلطان کی طرح فرار نہ ہو سکے اور جان بچانے کی خاطر ایمان سے دستکش ہو جانے پر مجبور ہو گئے۔

مقدس صلیب کے محافظ حبشہ میں وہ حربے استعمال کر رہے ہیں جو حربے کمیونزم کے علمبردار روس اور چین میں استعمال کرتے رہے ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حبشہ میں کسی شخص کو گرفتار کر لینے کے لیے محض یہ الزام لگا دینا انصاف کے تقاضوں کو پورا کر دیتا ہے کہ اس شخص نے شاہ کی توہین کی ہے۔ پھر وہ شخص اپنی زندگی کے چند سال کسی عقوبت خانے میں گزار کر گمنامی کی موت مر جاتا ہے۔ اب یہ مسلمانوں کا قصور ہے کہ اس الزام میں پکڑے ہمیشہ مسلمان ہی جاتے ہیں۔ چند سال قبل ایک سوڈانی ڈاکٹر نے جما کے مسلم علاقے کی جیل کا معاینہ کرنے کے بعد چار سو ایسے قیدیوں کی کہانی سنائی جن میں سے اکثر بوڑھے شیوخ تھے اور جو چار سے لے کر چھ سال سے بے داد و فریاد جیل میں پڑے سڑ رہے تھے۔ ان نیم جان بوڑھے مسلمان علماء سے شاہی خاندان کے کافی کے باغات میں بیگار لی جاتی تھی۔ یہ سب شاہ کی توہین کے الزام میں دھرے گئے تھے۔

مسلمان اکثریت کے علاقوں میں مسلمانوں کو سیاسی اور معاشی لحاظ سے بے دست و پا بنانے کے لیے، ان علاقوں میں امہرہ قبیلے کے آبادکار لا لا کر بسائے جا رہے ہیں اور مسلمانوں کی زمینیں اور باغات چھین چھین کر امہرہ آبادکاروں کے حوالے کیے جا رہے ہیں۔ مسلمانوں کی طرف سے آئینی جدوجہد کا جواب جبر و تشدد سے دیا جاتا ہے۔ کاشتکاروں کی طرف سے پُرامن مزاحمت کو کچلنے کے لیے متعدد مرتبہ مسلح فوجیں بھیجی گئی ہیں۔ صوبہ والو میں باٹی، کرفا اور آرگوبا میں نہتے عورتوں مردوں اور بچوں کا جس طرح شکار کھیلا گیا اس کی روداد شاید تاریخ کسی روز دنیا کو سنائے۔ خاک اور خون کا یہ کھیل صوبہ الو کے

ضلع یا جو اور صوبہ ہرار کے اضلاع جرسم اور کلیشا میں کھیلا گیا

۱۹۴۳ء کی ایک تاریک رات کو شاہی فوجوں نے اسواء کی مسلم ریاست پر حملہ کیا، سلطان محمد بالیو کو گرفتار کر کے ادیس ابابا بھیج دیا گیا یہاں آلم بیکا کی جیل میں اسے موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا اور پوری ریاست کو خاک کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا گیا ریاست کو یہ سزا کس جرم میں ملی۔ یہ ہنوز پردۂ اخفا میں ہے۔ آلم بیکا کی جیل صرف ایک سلطان محمد بالیو کا ہی مقتل نہیں ہے بلکہ یہاں متعدد سلاطین اور شیوخ موت سے ہمکنار ہو چکے ہیں۔

۱۹۴۸ء میں اہل ہرار نے خطرہ محسوس کرتے ہوئے ایک پُر امن مظاہرے میں شاہ سے بلا امتیاز مذہب و عقیدہ مساوی سلوک کی بھیک مانگی لیکن شاہ نے فوج بھیج کر ان کی جھولیاں دہشت گردی اور خوف و ہراس سے بھر دیں۔ پندرہ سو سے زائد افراد کو جیل میں ٹھونس دیا گیا اور ممتاز افراد کو غائب کر دیا گیا۔ معلوم نہیں زمین کھا گئی یا آسمان اُچک لے گیا۔ ۱۹۵۲ء میں صوبہ والو کے ضلع داوی کے بارہ دیہات میں فوج نے پچپن آدمیوں کو ان کے ماں باپ اور رشتہ داروں کے سامنے پھانسیوں پر لٹکا دیا اور دیہات کو تباہ و برباد کر دیا۔

ان مظالم کی شہادت غیر ہی نہیں اپنے بھی دے رہے ہیں۔ نیو یارک ٹائمز ۴ ار جولائی ۱۹۶۰ء کی اشاعت میں رقمطراز ہے، "ہیل سلاسی نے مندوبین سے یگرا عالم کے قصبے کے قتلِ عام کی کہانی بھی چھپانے کی کوشش کی جو اس کی پولیس نے گذشتہ مارچ میں کیا تھا اور جس میں سینکڑوں کاشتکار گولیوں سے بھون دیئے گئے تھے۔ ان کاشتکاروں نے اپنے جاگیرداروں کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔" لارڈ رینل آف راڈ اپنی کتاب "افریقہ کے مقبوضہ علاقوں میں سا بہائے ۱۹۴۱ء اور ۱۹۴۷ء کے درمیان برطانوی فوجی نظم و نسق" میں لکھتے ہیں کہ "برطانوی فوجی نظم و نسق اپنے آپ کو ذمے داری سے بری کرنے کے بعد دناکل ایریا پر اثر انداز ہونے والے ہر معاملے سے بے تعلق رہا لیکن دوسری طرف حبشیوں نے اوسا کے سلطان کو گرفتار کر لیا جس کی ریاست اس ایریا میں شامل تھی۔ اس طرح انہوں نے وہاں اپنا نظم و نسق دوبارہ قائم کرنے کا دعویٰ کیا۔"

حبشہ کا نیا دستور دفعہ ۱۲۱ میں بادشاہ کو یہ حلف اٹھانے کا پابند بنا تا ہے کہ: "ہم مقدس آرتھوڈاکس عقیدہ کا اقرار اور اس کا دفاع کریں گے" ۔ آرتھوڈاکس عقیدہ کے دفاع کا حق اس وقت تک ادا نہیں ہوتا جب تک کہ ملک میں بسنے والے ہر شخص کو طوعاً او کرہاً اس عقیدہ کا پابند نہ بنا یا جائے ۔ اور اگر یہ نہ ہو سکے تو کم از کم اسے اسکے دین کے مطابق زندگی نہ گذارنے دی جائے ۔ چنانچہ ۱۹۶۱ء میں ایک سول لا نافذ کر کے مسلمانوں کا پرسنل لا جس پر وہ صدیوں سے عمل کرتے چلے آ رہے تھے منسوخ کر دیا گیا ۔ اس سول لا کی بنیاد قوانین کے ایک قدیم مجموعے پر رکھی گئی ہے جسے ایک مصری قبطی الاسد الاعسل نے تیرھویں صدی عیسوی میں مرتب کر کے کلیسائی قوانین کو حبشہ میں متعارف کرایا تھا ۔ یہ کتاب یہودی قوانین، رواجی قوانین اور انجیل کے احکامات کا ایک ملغوبہ ہے اور عرصہ دراز تک حبشی قبطیوں کے مقدمات کے فیصلوں کے لیے سند کا کام دیتی رہی ہے ۔ حقیقت میں عیسائیت کے قوانین اور بے سروپا رسوم کے اس ملغوبے کو نیا لباس پہنا کر تراسی لاکھ مسلمانوں کے سر منڈھ دیا گیا ہے ۔

اس قانون کی دفعہ ۵۸۰ کی رُو سے عورت اور مرد کے بے نکاحی تعلق کو قانوناً تسلیم کیا گیا ہے ۔ اور اس تعلق سے جو اولاد پیدا ہو، اسے اگر مرد اپنی اولاد مان لے تو وہ وراثت کی حقدار قرار دی گئی ہے ۔ حبشی قبطیوں میں اسی نوعیت کی شادی رائج ہے ۔ شادی بیاہ کی تقریبات کی انجام دہی قانون کی رُو سے خاص سرکاری افسر کرتے ہیں ۔ مزید برآں اسلامی قانون میں جن رشتہ داروں کے درمیان نکاح جائز ہے مثلاً چچا زاد، خالہ زاد، پھوپھی زاد اور ماموں زاد بہن بھائی، سول لا کی رو سے ان کے درمیان نکاح ناجائز ہے ۔ (دفعات ۵۸۲ - ۵۸۳) اسی طرح تعددِ ازواج کو ممنوع قرار دیا گیا ہے اور عورت کو مرد کی طرح طلاق دینے کا اختیار دے دیا گیا ہے (دفعہ ۵۸۵) ۔ دفعات ۶۲۶ تا ۶۵۶ میں وراثت کا جو قانون بنا یا گیا ہے وہ اسلامی قانونِ وراثت کو بالکل ختم کر دیتا ہے ۔

مسلمانانِ حبشہ میں، ڈیڑھ دو صدی کے ظلم و ستم کا شکار بننے کے باوجود ابھی اتنی دینی غیرت باقی تھی کہ انتہائی حوصلہ شکن حالات میں بھی انہوں نے ٹھنڈے پیٹوں اس زبردستی کو برداشت کرنے سے

انکار کر دیا اور حبشی پارلیمان کے مٹھی بھر مسلمان ارکان نے مقدور بھر اس قانون کی ڈٹ کر مخالفت کی بلکہ خود بادشاہ کے سامنے بھی اپنے اعتراضات رکھ دیئے۔ لیکن اقتدار حق اور انصاف کے سامنے جھکنے کے لیے تیار نہ ہوا اور یہ قوانین تراسی لاکھ مسلمانوں کی ناپسندیدگی کے باوجود ڈنڈے کے زور سے ان پر نافذ کر دیئے گئے۔

اریٹریا کا المیہ اریٹریا بھی ان چند مسلمان ریاستوں میں سے ایک ہے جو حبشہ کے پڑوس میں ہونے کی سزا بھگت رہی ہیں لیکن اریٹریا باقی ریاستوں سے اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ اس نے کالے سامراج کے سامنے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا ہے اور مسلمانانِ اریٹریا آزادی کی خاطر جان کی بازی لگا رہے ہیں۔

اریٹریا کے مغرب اور شمال میں سوڈان، مشرق میں بحرِ احمر جنوب مشرق میں فرانسیسی سومالی لینڈ اور جنوب میں حبشہ واقع ہیں۔ بحرِ احمر پر اس کا ساحل ۶۷۰ میل لمبا ہے اور اس کے سامنے سمندر کے دوسری جانب یمن اور سعودی عرب کے ملک واقع ہیں۔ اس کی بائیس لاکھ پچاس ہزار کی آبادی مسلمانوں اور قبطی عیسائیوں پر مشتمل ہے جس میں مسلمان ۷۵ فی صد ہیں۔ ملک کا دار الحکومت اسمرا ہے جس کی آبادی ایک لاکھ پچاس ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ اہم بندرگاہیں مصوع اور عصب ہیں۔

قدیم زمانہ میں اریٹریا مصر کا ایک مقبوضہ تھا۔ پھر رومی عہد کے آغاز میں یہ ایک خود مختار ریاست بن گیا جس سے رومی سلطنت کے قریبی حلیفانہ تعلقات تھے۔ بنی امیہ کے زمانہ میں یہ اسلامی سلطنت کا جزو بن گیا اور چند صدیوں تک اسلامی خلافت کے تحت رہنے کے بعد یہاں ایک الگ سلطنت بن گئی جو سولھویں صدی تک خود مختار رہی اور حبش کی دست درازیوں کے باوجود اس کا مستقل وجود برقرار رہا۔ سولھویں صدی میں پرتگیزوں اور حبشیوں کی تاخت سے تنگ آکر اریٹریا والوں نے ترکوں کی سرپرستی قبول کر لی۔ ۱۸۶۵ء میں سلطان ترکیہ کے نائب کی حیثیت سے مصری حکومت نے اریٹریا کو اپنے انتظام میں لے لیا۔ آخر ۱۸۸۵ء میں اٹلی نے اس پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت سے لیکر ۱۹۴۱ء تک اریٹریا اٹلی کے سامراج کے تحت رہا۔ پھر جب دوسری جنگِ عظیم میں اٹلی نے

شکست کھائی تو اتحادی افواج نے اریٹریا پر قبضہ کر لیا۔ اور ان کی جانب سے برطانیہ نے اس کا انتظام سنبھال لیا۔

دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے کے بعد اریٹریا براہِ راست حبشی استعمار کی زد میں آگیا کیونکہ شاہ ہیل سلاسی کو یقین تھا کہ زود یا بدیر برطانیہ اریٹریا پر سے اپنا تسلط اٹھائے گا۔ شاہ ہیل سلاسی نے مناسب سمجھا کہ اپنے پرانے حلیف برطانیہ کی سرپرستی میں ہی اریٹریا کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کے لیے زمین ہموار کر لی جائے۔ اس مقصد کے لیے اس نے اریٹریا کے قبطی کلیسا کو آلۂ کار بنایا اور چند عیسائی اریٹریوں کو گانٹھ کر ملک میں یونینیسٹ پارٹی بنوا دی تاکہ جمہوریت کا نقاب اوڑھ کر اریٹرین عوام کی آزادی پر چھاپا مارا جا سکے۔ لیکن اریٹریا کے مسلمانوں کو حالات نے چوکنا رہنا سکھا دیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اریٹریا کے بارے میں ہیل سلاسی کے ارادوں سے بے خبر بھی نہیں تھے۔ چنانچہ انہوں نے فوراً ہی ملک کی آزادی کی خاطر منظم جدوجہد کرنے کے لیے ۴ دسمبر ۱۹۴۶ء کو اریٹرین مسلم لیگ پارٹی کی تشکیل کی۔ اگرچہ چار اور چھوٹی چھوٹی پارٹیاں بھی بنائی گئی تھیں لیکن بعد میں یہ سب پارٹیاں مسلم لیگ میں ضم ہو گئیں اور اس طرح ایک محاذ آزادی وجود میں آگیا۔ اریٹریا کی آزادی اور خود مختاری کے خواہشمند صرف مسلمان ہی نہیں تھے بلکہ اطالوی اقلیت اور مقامی عیسائی آبادی کی بھی غالب اکثریت اپنے ملک کو آزاد اور خود مختار دیکھنا چاہتی تھی۔ چنانچہ لبرل پروگریسو پارٹی کے نام سے ایک اور جماعت بھی قائم ہو گئی۔ اس طرح باشندگانِ اریٹریا علی اختلاف العقیدہ ملک کی آزادی کی خاطر دوش بدوش کھڑے ہو گئے۔

شاہ ہیل سلاسی نے جب یہ صورتِ حال دیکھی اور اسے سیدھی انگلیوں گھی نکلتا نظر نہ آیا تو وہ اوچھے حربے استعمال کرنے لگا۔ کرائے پر غنڈوں کی خدمات حاصل کی گئیں، انہیں اسلحہ فراہم کیے گئے اور اب اریٹریا میں دہشت انگیزی کا دور شروع ہوا۔ مسلم لیگ اور لبرل پروگریسو پارٹی کی نمایاں شخصیتوں پر دستی بموں سے حملے کیے گئے۔ مسلم لیگ کی اسمرا برانچ کے صدر سید عبدالقادر محمد صالح کبیری کو ۱۹۴۹ء میں خفیہ طور پر قتل کروا دیا گیا۔ اسی زمانہ میں حبشہ کے دہشت انگیزوں نے

لبرل پروگریسو پارٹی کے ممتاز رہنما قاضی جانہ ماشن بارے کو قتل کروا دیا۔ ممتاز حریت پسندوں کو قتل کرنے کے بعد بھی جب آزادی کی لہر تھمتی نظر نہ آئی تو یونینسٹ دہشت انگیزوں نے جبر و تشدد اور خوف و ہراس پھیلانے کی ایک عام مہم چلا دی۔ حریت پسندوں بالخصوص مسلمان قبائل کے کھیتوں پر حملے کر کے انہیں برباد کر ڈالا گیا اور مویشی لوٹ لیے گئے۔

اٹلی اور اتحادیوں کے درمیان ۱۹۴۷ء میں جو معاہدۂ امن طے پایا تھا اس کی رو سے چاروں اتحادی طاقتوں کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ معاہدے کے نفاذ کے ایک سال کے اندر اریٹریا کی قسمت کا فیصلہ کر دیں۔ چنانچہ باشندگانِ ملک کی مرضی معلوم کرنے کے لیے چاروں طاقتوں کا ایک کمیشن اریٹریا آیا، لیکن یہ لوگ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ اس کے بعد یہ مسئلہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں پیش کر دیا گیا۔

۱۹۵۰ء میں اقوام متحدہ نے برما، گواٹی مالا، ناروے، پاکستان اور جنوبی افریقہ کے نمائندوں پر مشتمل ایک کمیشن کی تشکیل کی اور اسے اریٹریا بھیج دیا۔ جس روز اس کمیشن کو اریٹریا کے دارالحکومت اسمرا میں پہنچنا تھا عین اسی روز باشندگانِ ملک کو ڈرا دھمکا کر مطالبۂ آزادی سے باز رکھنے کے لیے حبشہ نے اپنے حامی عیسائیوں سے اسمرا کی مسلمان آبادی پر حملہ کروا دیا۔ نتیجے کے طور پر زبردست لڑائی چھڑ گئی جو پانچ روز تک جاری رہی۔

حبشہ کی یہ چال بھی ناکام رہی اور اقوام متحدہ کے کمیشن نے اریٹریا کا دورہ کرنے کے بعد واپس جا کر متفقہ طور پر اس رائے کا اظہار کیا کہ ملک کی آبادی کی غالب اکثریت حبشہ کے ساتھ ملنے کو تیار نہیں ہے۔ بلکہ پاکستان کے میاں ضیاءالدین اور گواٹی مالا کے کارلاس گرسٹیا بوئر نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ دہشت انگیزی اور قبطی کلیسا کے اپنے اختیارات کے ناجائز استعمال نے آزادیٔ رائے کا دروازہ بند کر رکھا ہے لیکن ہمیں اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ملک کی آبادی کی غالب اکثریت آزادی چاہتی ہے۔ انہوں نے اس بات کی تصدیق کی کہ ملک کی عظیم مسلم آبادی اور اہم اطالوی اقلیت کے متعلق کبھی بھی یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ حبشہ کے ساتھ الحاق کو چپ چاپ قبول کر لیں گے۔ دونوں معزز ارکان نے بدلائل ثابت کیا کہ اریٹریا کو آزاد ہونا چاہیے تاکہ وہ از خود حبشہ کے ساتھ الحاق، وفاق یا مطلق خود مختار اور آزاد

رہنے کا فیصلہ کر سکے۔

حبشہ نے اریٹریا کو یوں ہاتھ سے جاتا دیکھ کر در پردہ اپنے مغربی حلیفوں اور ہم مذہبوں سے مدد کی بھیک مانگی۔ چنانچہ امریکہ نے حق اور انصاف کے تمام تقاضوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کمیشن کی رپورٹ کے برعکس جنرل اسمبلی میں ایک قرارداد کا مسودہ پیش کیا جس کی رُو سے اریٹریا کو حبشہ کے ساتھ وفاق بنانے پر مجبور کیا گیا۔

۲ر دسمبر ۱۹۵۰ء کو جنرل اسمبلی نے دس کے مقابلے میں چھیالیس ووٹوں کے ساتھ اس قرارداد کو منظور کر لیا۔ اپنی اس قرارداد کے ذریعہ سے جنرل اسمبلی نے سفارش کی کہ اریٹریا کو حبشہ کے ساتھ وفاق بنانا چاہیے۔ اس وفاق کی جو عملی صورت تجویز کی گئی وہ یہ تھی کہ حکومتِ حبشہ کو جس کے سیاہ و سفید کا مالک شاہ ہیل سلاسی ہے، وفاقی حکومت کا درجہ دیا گیا اور پورے وفاق کے دفاع، امورِ خارجہ، مالیات، تجارت، مواصلات اور بندرگاہوں کے انتظام اور نظم و نسق کے اختیارات اس کے حوالے کر دیئے گئے۔ اریٹریا کو صرف ان امور میں داخلی خود مختاری دی گئی جن کا اختیار وفاقی حکومت کو نہ تھا مثلاً داخلی معاملات کے لیے قانون سازی، انتظامیہ، عدلیہ، پولیس، ٹیکسیشن اور اپنے داخلی بجٹ کی تیاری۔ گویا عملاً اریٹریا کی حیثیت حبشہ کے ایک صوبے کی سی قرار دی گئی اور اس کی خود مختاری صوبائی خود مختاری سے زیادہ کوئی حیثیت نہ رکھتی تھی۔ اس کے علاوہ جنرل اسمبلی نے اپنی قرارداد میں یہ سفارش بھی کی کہ اریٹریا اور حبشہ کے مساوی نمائندوں پر مشتمل ایک امپیریل فیڈرل کونسل بنائی جائے اور اریٹریا کے لیے جمہوری اصولوں پر مبنی ایک دستور مہیا کیا جائے۔

اس طرح نظریہ بظاہر اقوامِ متحدہ نے اریٹریا کو شاہ ہیل سلاسی کے حوالے کر دیا، اگرچہ حقیقت میں اریٹریا کو حبشہ کی کالونی بنانے کا سہرا امریکہ کے سر بندھتا ہے۔ باقی جہاں تک وفاق اور تقسیمِ اختیارات کا تعلق ہے تو یہ تو محض باشندگانِ اریٹریا کی اشک شوئی اور دنیا کو بے وقوف بنانے کے لیے ایک طلسمِ ہوشربا تھا۔ کیونکہ شاہی مطلق العنانیت کے تحت جمہوری دستور اور داخلی خود مختاری کاٹھ کے گھوڑے سے مختلف کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اس کی شہادت وفاق بننے کے بعد کے وہ دس سال دیں گے

بعد میں اریٹیریا میں جمہوری آزادیاں کچل دی گئیں، حبشی فوج نے دہشت گردی اور غارت گری کا بازار گرم کر دیا، اریٹیریا کا پرچم، امتیازی نشانات اور سرکاری زبانیں (عربی اور تگری) ختم کر دی گئیں، سینکڑوں اریٹیریوں کو بغیر مقدمہ چلائے یا تو قتل کر دیا گیا یا جیلوں میں ٹھونس دیا گیا جہاں حبشی پولیس نے انہیں ناکردہ گناہوں کا اقبال کرانے کے لیے ناقابلِ بیان جسمانی اور ذہنی اذیتیں پہنچائیں۔

دس سال کے عرصہ میں جب اس بات کا اطمینان ہو گیا کہ اب دنیا اریٹیریا کو بھول چکی ہے اور خود اریٹیریوں میں اتنی جان باقی نہیں ہے کہ وہ کسی بے انصافی کے خلاف آواز اٹھا سکیں تو وفاق کے طلسم ہوشربا کو مزید جاری رکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ چنانچہ ۱۴ نومبر ۱۹۶۲ء کو حبشی سلطنت میں اریٹیریا کے باقاعدہ ادغام کا اعلان کر دیا گیا۔

اقوامِ متحدہ کی قرارداد کی اس صریح خلاف ورزی پر اریٹیریا کے عوام یہ امید لے کر اقوامِ متحدہ میں پہنچے کہ اگر حق اور انصاف نہیں تو اپنی ہی منظور کی ہوئی قرارداد کا پاس کرتے ہوئے ادارۂ اقوامِ متحدہ اس سلسلے میں کوئی مداخلت کرے گا لیکن ان کی قانونی درخواستوں کو وہاں پرِ کاہ کے برابر بھی وقعت نہ دی گئی۔

دھونس اور دھاندلی کے اس مسلسل مظاہرے نے بالآخر اریٹیریا کے مسلمانوں کا پیمانۂ صبر لبریز کر دیا اور انہوں نے کالے سامراج سے نجات حاصل کرنے کے لیے جو افریقہ میں گورے سامراج کی جگہ لے رہا ہے، مجاہدینِ الجزائر کے بنائے ہوئے راستے پر چلنے کا فیصلہ کر لیا۔ اریٹیرین لبریشن فرنٹ (محاذِ آزادی) کے نام سے وہاں کے نوجوانوں نے ایک انقلابی تنظیم قائم کر لی ہے۔ مسلح جدوجہد کی خاطر منتظم گوریلا جنگ جو جناب حمید ادریس اواتی کی قیادت میں ایک آزاد فوج کا قیام بھی عمل میں آچکا ہے۔ اور اب اریٹیرین مجاہد بڑی بہادری سے حبشہ کی استعماری فوجوں کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ کرائے کے سپاہی ان سرفروشوں کے مقابلے میں کئی مرتبہ ہزیمت اٹھا چکے ہیں اور گذشتہ ڈیڑھ دو سال میں انتہائی سنگین نوعیت کے واقعات بار بار رونما ہو چکے ہیں لیکن دنیا ان سے بے خبر ہے کیونکہ شاہ ہیل سلاسی نے اریٹیریا کی مکمل ناکہ بندی کر رکھی ہے۔ کوئی صحافی اور نامہ نگار آزادی کے ساتھ اریٹیریا میں نہیں گھوم

سکا۔ چند ہی مہینے قبل یعنی جون ۱۹۶۳ء میں اریٹرین پولیس کمشنر بریگیڈیر جنرل ٹڈلا یوک بیٹ کو اسمرا میں حبشی افسروں نے اس وجہ سے قتل کر دیا کہ اس نے سات ہزار نفوس پر مشتمل پولیس فورس کو نہتا کر دینے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن اس جرم پر یہ کہہ کر پردہ ڈال دیا گیا کہ پولیس کمشنر نے خودکشی کر لی ہے۔

جہاں تک مسلمانانِ اریٹریا کا تعلق ہے وہ تو سر سے کفن باندھ کر آزادی کی چتا میں چھلانگ لگا چکے ہیں۔ کامیابی اور ناکامی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن عالمِ اسلام کی بے حسی کو تاریخ کبھی معاف نہیں کریگی جس کے کشتگانِ تغافل کی فہرست بہت طویل ہو چکی ہے۔

"ندائے ملت" کی اشاعت خاص

صدیق حسن نمبر

وہ اُتر پردیش کے سینئر آئی، سی، ایس آفیسر تھے — لیکن خدا کی شان اور اس کی دین ہے کہ موجودہ ہندوستان میں اسلام پر جینے اور مرنے کی آرزو رکھنے والوں کے لیے ایک آئی، سی، ایس کی زندگی نشانِ راہ بن رہی ہے، روشنی بن رہی ہے، اور مایوسیوں کو صدائے لاتحزن سنا رہی ہے۔

ندائے ملت کے تقریباً ۶۰۰ صفحات پر اس زندگی کے کچھ اوراق پڑھیے

ندائے ملت کا یہ نمبر ہندوستان کے معروف اور مقتدر مسلم اور غیر مسلم حضرات کے مضامین سے آراستہ ہو کر — ۱۴ دسمبر ۶۳ء — کو نکل رہا ہے

اس نمبر کی قیمت ۵۰ نئے پیسے، علاوہ ڈاک خرچ۔ سالانہ خریداری قبول کرنے والوں کے لیے کوئی علیحدہ قیمت نہیں

"ندائے ملت" لکھنؤ فون: ۲۲۵۲۴

حُجّیتِ حدیث

(مولانا مفتی محمد حسین صاحب نعیمی صدر مدرس جامعہ نعیمیہ لاہور)

[یہ مقالہ بزم علوم اسلامیہ کے ہفتہ وار اجتماع میں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ، لاہور کے حبیبیہ ہال میں پڑھا گیا۔ یہ سلسلۂ مضمون کی صرف پہلی کڑی ہے۔ اس کے باقی حصّوں کو، یعنی کیا احادیث میں تضاد اور اختلاف پایا جاتا ہے، اور اگر ہے تو اس کی نوعیت کیا ہے اور کیا احادیث غیر عقلی مضامین پر مشتمل ہیں۔ مولانا نے مکمل کرنے کا وعدہ فرمایا ہے ——— مرتب]

قرآن کریم صرف الفاظ کا نام نہیں ہے بلکہ الفاظ و معانی دونوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ اللہ حکیم و خبیر نے قرآنِ کریم کی حفاظت کا جو وعدہ فرمایا ہے کہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ اس کا تعلق بھی الفاظ و معانی دونوں سے ہے۔ لہٰذا مکمل حفاظت کے لیے ضروری ہے کہ الفاظ کے ساتھ ساتھ اُس کے معنیٰ کا تحفظ بھی ہو۔

لاکھوں انسانوں نے نہ صرف الفاظ قرآن کو اپنے سینوں میں محفوظ کیا بلکہ ترجمانِ وحی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے جو معنی و مطالب متعیّن کیے تھے انہیں بھی بڑی احتیاط کے ساتھ اپنے دلوں میں بٹھایا اور پھر ہر دَور میں انہیں تواتر کے ساتھ نقل کرتے چلے آئے۔ یہ وہ طریق ہے جس سے یہ مقدس امانت (قرآن پاک اور کتبِ احادیثِ نبوی)، نسلاً بعد نسلٍ تعلیم و تعلّم، درس و تدریس کے ذریعہ منتقل ہوتی چلی گئی۔

درحقیقت احادیث مبارکہ قرآنِ کریم کی قولی و عملی تفاسیر کا مجموعہ ہے۔ کتابِ الٰہی کے ساتھ رسولوں کے آنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ کلامِ الٰہی کے معانی و مطالب بھی سمجھاتے جائیں۔ خود قرآن نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے فرائض اور ان کی بعثت کے اغراض مقاصد بیان کرتے ہوئے

صاف اور واضح طور پر ارشاد فرما دیا کہ:

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ۔

وہ اللہ جس نے ان پڑھوں میں خود انہی میں سے رسول مبعوث فرمایا جو اُن کے سامنے اُس کی آیات تلاوت کرتا ہے اور انہیں پاکباز بناتا ہے اور کتاب کی تعلیم دیتا اور حکمت کے رموز سے آگاہ فرماتا ہے جبکہ لوگ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا تھے

مخلوق کو خالق کا پیغام پہنچانا اور اُس کے مطالب بیان کرنا بھی رسول کے فرائض میں شامل ہے چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے کہ:

أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ

یعنی ہم نے آپ کی طرف ذکر اس لیے نازل فرمایا تاکہ آپ لوگوں کے لیے بیان کریں جو اُن کی طرف نازل کیا گیا ہو، شاید وہ غور و فکر سے کام لیں۔

ان آیات کی روشنی میں دیکھا جائے تو رسول کے سوا کسی دوسرے شخص کو قرآن کی تشریح و تفسیر کرنے کا کسی طرح بھی حق نہیں پہنچتا۔ کیونکہ اللہ کے کلام کے اصل معنیٰ یا تو اللہ تعالیٰ قرآن میں خود بیان کرتا ہے کہ: ان القرآن یفسر بعضہ بعضاً، یا پھر اس کا رسول جو اللہ سے ہمکلامی کے منصب پر فائز ہے بیان کر سکتا ہے۔ کسی اور شخص کے لیے کلامِ الٰہی کے منشا اور مقصد متعین کرنا ممکن نہیں۔ اور اگر کوئی فرد کلامِ الٰہی کے معنیٰ کے مختلف احتمال بیان کرے تو اُس کو "تاویل" کہا جاتا ہے وہ تفسیر نہیں ہے۔ کیونکہ تفسیر کسی کلام کے اُس معنیٰ کو کہتے ہیں جو متکلّم نے کلام سے خود مراد لیے ہوں۔ اسی لیے تفسیر کے ہوتے ہوئے تاویل کا کوئی اعتبار نہیں کیا جاتا۔

علاوہ ازیں یہ حقیقت بھی ناقابلِ انکار ہے کہ کلام کے لب و لہجہ اور اس کے اسلوب بیان اور الفاظ کے زیر و بم سے جو مطالب سمجھے جا سکتے ہیں وہ لکھی ہوئی عبارت پڑھنے سے حاصل نہیں ہو سکتے۔ ہمیں تو قرآنِ کریم کے لکھے ہوئے الفاظ ہی پہنچے ہیں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن براہِ راست

نازل ہوا اور آپ نے کلام کے لب و لہجہ کو بطورِ خود حاملِ وحی سے سنا۔ اس صورت میں قرآن کے معنیٰ و مطالب کا صحیح ادراک آپ کے سوا دوسرا نہیں کر سکتا۔ اس لیے بھی آپ کے بیان کردہ مطالب و معانی واجب الاتباع لازم العمل ہیں اور آپ کے اعمال و اقوال صحیفۂ ربانی اور احکاماتِ قرآنی کی صحیح تفسیر و تشریح ہو سکتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ قرآن کریم کامل و مکمل آسمانی کتاب ہے جس میں تمام علوم و ضوابط مندرج ہیں اور بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے آخری دستور العمل ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس میں تمام روزمرہ کے فقہی مسائل اور ہر پیش آمدہ جزئیات کے احکام علیحدہ علیحدہ درج ہیں اور ہر حکم کی پوری تفصیل موجود ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو قرآن کریم سینکڑوں جلدوں میں نازل ہوتا یہ تیس پارے کیونکر کافی ہو سکتے تھے جو صرف پانچ سو آیات متعلقہ احکام پر مشتمل ہیں۔ تبیان و تفصیل کا صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ قرآن فطرتِ انسانی کے تمام مدارجِ ترقی کے لیے قطعی اصول کا جامع ہے۔ اساسی احکام بنیادی امور اور کلیات کو شامل ہے۔ بنی نوع انسان کے لیے ارتقائی مراحل کی نشاندہی کرتا ہے اخلاقی و عمرانی ضوابط بیان کرتا ہے جن سے بے شمار جزئیات اور ان کے احکامات مستنبط ہو سکتے ہیں۔ احادیثِ مبارکہ انہی کلیات اور اصول کی وضاحت کرتی ہیں اور ان سے آیاتِ قرآنیہ کے مطالب کا تعین اور معنی مقصودی کا تبیّن ہوتا ہے۔

کیا حدیث سے فرقہ بندی اور اختلافِ اُمت کی راہیں کھلتی ہیں؟ یہ ایک عامی اور عقل و خرد سے عاری انسان تو کہہ سکتا ہے مگر جس کو اللہ تعالیٰ نے عقلِ سلیم اور بصیرت و یقین کی دولت سے نوازا ہے وہ یہ گمان نہیں کر سکتا۔ مختلف فرقوں کی نظریاتی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ ہر فکری تحریک کی بنیاد قرآنِ پاک کی آیات پر رکھی گئی ہے اور ہر فرقہ نے سب سے پہلے اپنے نظریات کی تائید میں آیاتِ قرآنیہ سے استناد کیا ہے۔ اور پھر احادیثِ مبارکہ کو دوسرے درجہ میں رکھا ہے۔ خوارج آیات ہی سے استدلال کرتے تھے۔ معتزلہ بھی قرآن کریم کے حوالہ جات سے اپنے مسلک کی تائید کرتے رہے۔ اور اسی طرح اہلِ تشیُّع، اہلِ حدیث، اہلِ سنت اپنے اپنے مذاہب کی تائید میں قرآن کریم سے استدلال کرتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس

ہر فرقہ اور ہر جماعت پہلے قرآن ہی کو سند میں لاتی ہے۔ اندریں حالات امّت کے اختلاف و افتراق کی وجہ صرف احادیثِ مبارکہ کو قرار دینا دیانت وصداقت کے منافی ہے۔ منکرینِ حدیث کا یہ اتہام ہے۔ ایک حربہ ہے جو وہ احادیث کے خلاف استعمال کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اختلافِ امت کو دُور کرنے کے لیے حدیثِ رسول ہی بہترین علاج ہے، تاکہ تمام امّتِ مُسلمہ قرآنِ کریم کی اس توضیح وتفسیر پر متفق ہو کر عمل پیرا ہو جو اللہ کے رسول نے بیان کی ہیں۔ اور اگر ہر فرد و بشر قرآن کی تفسیر، تشریح، معانی ومطالب اپنی اپنی رائے اور عقل سے کرتا جائے تو ہم قرآنِ پاک کی مرکزی تعلیم سے دُور ہوتے جائیں گے۔ حالانکہ تمام انسان یکساں فہم وفراست نہیں رکھتے اور سب کی استعداد برابر نہیں۔ ایسی صورت میں امّت میں افتراق وانتشار کی وسیع خلیج کا اور زیادہ وسیع ہوجانا ایک لازمی نتیجہ ہے۔

کیا احادیثِ مبارکہ ثابت اور محفوظ نہیں ہیں؟ جناب رسالت مآب علیہ التحیۃ والصلوٰۃ کا معجزہ ہے کہ عرب کے ان پڑھ اور سخت کوش انسانوں کو ایسی تربیت، تعلیم اور فیضِ صحبت سے نوازا جس سے وہ حضرات اتقاء، زہد، اخلاص، سلامتِ طبع، جودتِ ذہن، صفاء باطن، صبر واستقلال اور محبتِ رسولؐ کے اس درجہ پر پہنچ گئے کہ آج ان کی نظیر صفحۂ عالم پر نہیں مل سکتی۔ سچ ہے اِذَا اَرَادَ اللّٰہُ اَمْرًا ھَیَّأَ اسبابَہٗ یعنی جب اللہ کسی کام کو پُورا کرنا چاہتا ہے تو اس کے اسباب بہم پہنچا دیتا ہے۔ حضور علیہ السلام کے اقوال وافعال کی روایت کرنے کے لیے پاک باز وپاک طینت اہلِ ایمان، مردانِ خدا، صحابۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کو منتخب فرمایا جو آپ کی ہر ادنیٰ سے ادنیٰ بات کو نہایت غور سے مطالعہ کرنے کے عادی تھے اور آپ کی روش پر عمل پیرا ہونے کو باعثِ نجاتِ اُخروی سمجھتے تھے، صرف بغرض عمل ہی ضبط نہیں کرتے تھے بلکہ وہ جانتے تھے کہ تبلیغ احکام اور تعلیم اسلام بجائے خود ایک عظیم فرض اور ثواب ہے۔ ان صحابۂ کرام نے آپ کے اقوال، حرکات وسکنات کو بگوشِ بصیرت سنا اور بچشمِ عبرت ملاحظہ کیا۔ اور پوری دیانت اور امانت کے ساتھ بے کم وکاست اپنے بعد کے تابعین تک پہنچایا پھر ان تابعین کرام نے نہایت عرق ریزی اور جانفشانی کے ساتھ احادیث قلمبند کیں۔ اُنہی کی کاوشوں کا ثمرہ ہے کہ آج ہم بلادقت دینی سرمایہ اور ربانی ہدایات سے مستفید ہو رہے ہیں جس تدر تنقیح اور تحقیق احادیث

کے بارے میں ان بزرگوں نے کی ہیں یقیناً کسی مذہب میں اس کی مثال موجود نہیں بلکہ ہمارا یہ دعوی ہے کہ اس سے زیادہ تحقیق و تنقید ممکن ہی نہیں۔ انہی برگزیدہ ہستیوں نے علم اسماء الرجال کی بنیاد ڈالی تاکہ رُواۃِ حدیث کے حالات اور اُن کا علمی معیار، حفظ و ضبط، اتقاء و اخلاق وغیرہ امور کا پتہ لگ سکے۔ اور اصولِ حدیث و اقسام حدیث بڑی وضاحت سے مرتب فرماتے۔ متواتر، مشہور، عزیز، غریب، مرفوع، موقوف، متصل، منقطع، مرسل، مقطوع وغیرہ اقسام قائم کر کے ہر ایک حدیث کی حجیت کا موازنہ کیا۔ تطبیق و ترجیح کے قواعد مقرر کیے۔ موضوع و ضعیف، ثابت و قوی کی پوری پوری توضیح کی جس سے ملحدوں کی تمام موضوع اور غلط احادیث علیحدہ ہو گئیں۔ صحیح و سقیم میں امتیاز قائم ہو گیا۔ علم حدیث کی تنقیح و تکمیل کے لیے کئی علوم ایجاد کیے۔ جن کے موجد یہی محدثین و مجتہدین ہیں۔ مثلاً :-

اصول حدیث اس علم میں کتاب و سنت سے مسائل و احکام استنباط کرنے کے ضابطہ اور اصول بیان کیے گئے ہیں اور تعارضِ اُدلّہ کے وقت تطبیق اور ترجیح کے قواعد کا ذکر ہے۔

علم درایت اس میں ان اصول کو مرتب کیا گیا ہے جن کے ذریعہ متنِ حدیث کا حال معلوم ہو سکے۔ یہ اصول سو سے زائد ہیں۔ اس علم میں محدث زیادہ تر ممارست اور مداولتِ احادیث کی وجہ سے ایک ذوقی کیفیت سے مدد لیتا ہے۔

علم النظر فی الاسناد اس میں حدیث کی سند پر بحث کی جاتی ہے اور سند کے اتصال و انقطاع کا پتہ چلایا جاتا ہے اور اس کا معیار قائم کیا جاتا ہے۔

علم روایت اس میں طرق روایت سے بحث کی جاتی ہے اور دیکھا جاتا ہے کہ حدیث کی روایت بالسمع ہے یا بالقرأت ہے یا بالمشاہدہ یا بالاجازت ہے وغیرہ۔

علم طبقات الحدیث اس میں حدیث کے درجات بیان کیے جاتے ہیں اور بتلایا جاتا ہے کہ زیر بحث حدیث کا راوی طبقاتِ اربعہ میں سے کس طبقہ کا ہے۔

علم الجرح والتعدیل اس علم میں راوی کے مجروح و مطعون ہونے کے اسباب ذکر کیے جاتے ہیں۔ اور راویوں کے عدل، ثقاہت، حفظ اور ضبط و فہم کا بیان کیا جاتا ہے۔

علمِ عللِ حدیث | یہ علم نہایت ہی دقیق اور عمیق ہے۔ اس میں وفایات، موالید، مواطن، القاب اور اسمار کے علاوہ راوی کے الفاظِ حدیث کی بحث کی جاتی ہے۔

علمِ تصحیفِ اسمار | ہم شکل ناموں کی تشریح، مترادف و مشترک اسماء کا امتیاز، قرائن کے ذریعہ حاصل کرنے کے ضابطے بیان کیے جاتے ہیں۔

علمِ اسمار الرجال | یہ علم راویانِ حدیث کی سوانح عمری اور تاریخ ہے۔ اس میں راویوں کے نام، لقب، حسب و نسب، علم و فضل، دیانت و تقوی، حفظ و ذکاوت، صحت و مرض، شباب، شیاب، ملاقات اور معاصرانہ پہلوؤں کا بیان ہوتا ہے۔

کوئی قوم اور کوئی ملت دنیا میں ایسی نہیں گزری جس نے اسمار رجال جیسا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو اور راویوں کی زندگی کے ہر پہلو اور بے شمار شخصیتوں کے تمام عادات و اطوار، احوال و کوائف اتنی تفصیل کے ساتھ مدون کیے ہوں جس کی بدولت آج ۵ لاکھ راویوں کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔ اس فنِ شریف کی وجہ سے صحیح و غیر صحیح روایت کا امتیاز بآسانی حاصل ہو جاتا ہے۔

ایک مرتبہ امام عبداللہ حاکم سے ایک شخص نے حدیث بیان کی، حاکم نے دریافت کیا کہ یہ حدیث تم نے کب سنی اور کس سے سُنی۔ اس شخص نے کہا کہ عبداللہ ابن حمید سے فلاں سن میں سُنی ہے۔ امام نے اپنے شاگردوں کی طرف دیکھ کر فرمایا "عبداللہ ابن حمید اس کے بیان کردہ وقتِ روایت سے سات سال پہلے انتقال کر چکے ہیں لہٰذا یہ حدیث صحیح نہیں۔ اسی طرح خلیفہ ہارون الرشید کے دربار میں خیبر کے یہودیوں نے ایک دستاویز پیش کی جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب تھی۔ اس میں لکھا تھا کہ خیبر کے یہودیوں کو جزیہ معاف ہے۔ یہ دستاویز جب محدثین کے سامنے پیش ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ یہ جعلی ہے کیونکہ اس پر حضرت سعد ابن معاذ کی گواہی ہے اور آپ غزوۂ خندق کے بعد وفات پا گئے تھے اور خیبر اس وقت تک فتح نہیں ہوا تھا لہٰذا اس دستاویز پر سعد ابن معاذ کی شہادت درست نہیں۔ دوم یہ کہ دستاویز پر کاتب کا نام معاویہ ابن ابوسفیان لکھا ہے اور حضرت معاویہ فتح خیبر تک اسلام نہیں لاتے تھے۔

اس دستاویز کی غلطی علم اسماء رجال کی مدد سے ظاہر ہوئی۔ اسی طرح حدیث کی تحقیق و تنقید میں علم اسماء رجال نہایت کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ اور اس سے حدیث کی صحت اور ضعف کا بآسانی پتہ چل جاتا ہے۔ محدثین کرام نے اسی علم کے ذریعہ موضوع، ضعیف، قوی، متصل، منقطع، مرسل، مقطوع وغیرہ احادیث چھانٹ کر رکھ دی ہیں اور اب حدیث کے درجات معلوم کرنے میں کوئی دشواری باقی نہیں رہی۔ اس فن میں سب سے پہلی تصنیف شیخ یحییٰ ابن قطان المتوفی ۱۹۸ھ کی ہے۔ امام بخاری و مسلم نے بھی اس فن میں کتابیں لکھی ہیں۔ علمائے بخارا نے ایک مرتبہ امام محمد بن اسماعیل بخاری کے امتحان کے لیے دس محدث منتخب کیے اور ہر ایک کو دس دس احادیث اس طرح پیش کرنے کو کہا کہ حدیث کی اصل سند سے نہ سنایا جائے بلکہ ایک صد احادیث کی اسناد آپس میں تبدیل کر کے لگائیں اور باری باری سے دس آدمی دس دس حدیثیں بدلی ہوئی سند سے امام بخاریؒ کو سنا کر ان کی تصحیح کرائیں۔ جب ہر ایک نے دس دس احادیث سنا دیں تو امام بخاری نے فرمایا کہ یہ احادیث ان راویوں سے مجھے معلوم نہیں۔ ان احادیث کے اصل راوی اس طرح ہیں اور ہر حدیث کے اصل راویوں کو ان حدیث سے لگا دیا اور پھر حافظہ کا یہ کمال دکھایا کہ جس ترتیب سے وہ سو احادیث سنی تھیں اسی ترتیب سے احادیث کی تصحیح کر کے دہرائیں۔

گویا امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اسماء رجال کو اس قدر جانتے تھے اور راویانِ حدیث کو اس طرح پہچانتے تھے کہ ہر راوی کا سلسلہ اور اس کی بیان کردہ احادیث ان کے سامنے موجود تھیں۔ اسی قسم کے محدثین کی بیان کردہ احادیث میں بہت کم غلطی کا امکان ہے۔ کیا ان حالات کے پیش نظر یہ کہنا صحیح ہوگا کہ احادیث محفوظ نہیں اور ان کا کوئی اعتبار نہیں؟

اس موقع پر مجھے چند معروضات اور بھی پیش کرنی تھیں جن میں یہ بتلانا تھا کہ کیا احادیث میں تضاد و اختلافِ معانی پایا جاتا ہے اور اگر ہے تو اس کی کیا نوعیت ہے اور یہ کہ کیا احادیث غیر عقلی مضامین پر مشتمل ہیں اور کیا وہ کسی طرح عقلِ سلیم کے مطابق ثابت کی جا سکتی ہیں؟ وقت نہ ملنے کی وجہ سے ان پہلوؤں کو کسی دوسرے موقع کے لیے اٹھا رکھتا ہوں۔

رسائل و مسائل

خروج کے مسئلے میں امام ابوحنیفہؒ کا مسلک

سوال - ترجمان القرآن نومبر ۱۹۶۳ء کے پرچہ میں مسئلہ خروج کے متعلق میرا سابق خط اور اس کا جو جواب شائع فرمایا گیا ہے اس کے لیے میں آپ کا ممنون ہوں۔ مگر افسوس ہے کہ اس جواب سے میرا وہ خلجان دور نہ ہوا۔ جو مسئلہ خلافت کے مطالعہ سے امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کے متعلق میرے دل میں پیدا ہوا تھا۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اپنی گزارشات کو ذرا تفصیل سے آپ کے سامنے پیش کروں۔ امید ہے کہ ان کا جواب بھی آپ ترجمان القرآن میں شائع فرمائیں گے تاکہ قارئین ترجمان کے معلومات میں اضافہ کا موجب بنے۔

"مسئلہ خلافت" میں آپ نے امام ابوحنیفہؒ کا جو مسلک بیان فرمایا ہے اس میں آپ نے "ظالم فاسق" کی امامت کے متعلق مسلک امام ابوحنیفہؒ کے تین بڑے بڑے نکات بیان کیے ہیں۔ ایک یہ کہ امام اعظم رحمہ اللہ خوارج و معتزلہ کی طرح نہ تو اس کی امامت کو اس معنی میں باطل قرار دیتے ہیں کہ اس کے تحت کوئی بھی اجتماعی کام جائز طور پر انجام نہ پا سکے اور مسلم معاشرہ اور ریاست کا پورا نظام معطل ہو کے رہ جائے، اور نہ وہ مرجئہ کی طرح اس کو ایسا جائز اور برحق تسلیم کرتے ہیں کہ مسلمان اس پر مطمئن ہو کر بیٹھ جائیں اور اُسے بدلنے کی کوشش نہ کریں۔ بلکہ امام موصوف ان دونوں انتہا پسندانہ نظریات کے درمیان ایسی امامت کے بارے میں ایک معتدل اور متوازن نظریہ پیش کرتے ہیں وہ یہ کہ اس کے تحت اجتماعی کام سب کے سب جائز ہوں گے۔ لیکن یہ امامت بجائے خود ناجائز اور باطل ہوگی۔ دوسرا نکتہ یہ کہ ظالم حکومت کے خلاف ہر مسلمان کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حق حاصل ہے، بلکہ یہ حق ادا کرنا سب مسلمانوں پر فرض ہے۔ تیسرا نکتہ یہ ہے کہ امام اعظمؒ کے نزدیک ایسی ظالم حکومت کے خلاف خروج بھی جائز ہے بشرطیکہ یہ خروج فساد و بدنظمی پر منتج نہ ہو بلکہ فاسق امامت کی جگہ صالح امامت کا قائم ہو جانا متوقع ہو۔ اس صورت میں خروج نہ صرف جائز بلکہ واجب ہے۔

اس سلسلہ میں میری گزارشات یہ ہیں کہ یہ کہنا کہ "امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک "ظالم فاسق" کی امامت باطل

ہے:" اور "امام اعظمؒ کے نزدیک "ظالم فاسق" کی حکومت کے خلاف خروج جائز ہے" امام ابوحنیفہ کے مذہب کی صحیح ترجمانی نہیں ہے۔ میرے نزدیک اس بارے میں امام ابوحنیفہؒ کا مذہب یہ ہے کہ ظالم فاسق اگر قوم پر اپنی قوت اور طاقت کے غلبہ سے بھی مسلط ہو جائے جس کو فقہاءؒ کی اصطلاح میں "متغلب" کہا جاتا ہے اور اپنے احکام کو طاقت کے ذریعہ نافذ کرنے کی قدرت رکھتا ہو تو گو وہ ظالم و فاسق بھی ہو اور اس کے ساتھ متعارف طریقوں سے بیعت بھی نہ ہوئی ہو، مگر امام ابوحنیفہؒ اس کی امامت کو اس معنے کر کے معتبر قرار دیتے ہیں کہ اس کے خلاف خروج و بغاوت کو ناجائز سمجھتے ہیں۔ اور جس طرح کہ اس کی امامت کے تحت دوسرے اجتماعی کاموں کو جائز اور معتبر قرار دیتے ہیں اسی طرح خروج اور بغاوت کو بھی ایسی حکومت کے بالمقابل حرام اور ناجائز قرار دیتے ہیں۔ میری اس رائے کی تائید فقہاء مذہب حنفی کے درج ذیل اقوال سے ہو سکتی ہے:

والامام يصير اماما بالمبايعة من الاشراف والاعيان۔ وكذا باستخلاف امام قبله وكذا بالتغلب والقهر كما في شرح المقاصد۔ قال في المسايرة ويثبت عقد الامامة اما باستخلاف الخليفة اياه واما ببيعة جماعة من العلماء او من اهل الرأي والتدبير... ولو تعذر وجود العلم والعدالة فيمن تصدى للامامة وكان في صرفه عنها اثارة فتنة لا تطاق حكمنا بانعقاد امامته كيلا نكون كمن يبني قصرا ويهدم مصرا... وتجب طاعة الامام عادلا كان او جائرا اذا لم يخالف الشرع فقد علم ان الامام يصير اماما بثلاثة امور لكن الثالث في الامام المتغلب۔ وان لم تكن فيه شروط الامامة۔ اھ (رد المحتار ج ۳ ص ۴۲۵)۔ بہرحال امام میں عدالت شرط ہے مگر صحت امامت کے لیے نہیں بلکہ اولویت کے لیے شرط ہے۔ اس بنا پر فاسق کی امامت کو مکروہ کہا گیا ہے نہ کہ غیر صحیح۔ وعند الحنفية ليست العدالة شرطا للصحة فيصح تقليد الفاسق الامامة مع الكراهة اھ (شامی ج ۱ ص ۵۱۲)۔ اسی قانون کے تحت حنفیہ نے متغلب کی امامت کو صحیح کہا ہے۔ وتصح سلطنة متغلب للضرورة اھ ایسے فاسق کے متعلق امام ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ بیان کیا گیا ہے: ويجب ان يدعى له ولا يجب الخروج عليه كذا عن ابي حنيفة اھ۔ یہ تمام عبارتیں ابن ہمام نے مسایرہ میں ذکر کی ہیں۔ جن سے صاف طور پر یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جس طرح ایک فاسق ظالم

کی حکومت کے تحت دین کے دوسرے اجتماعی کام جائز طریقہ سے انجام دیئے جا سکتے ہیں اسی طرح اس حکومت کے خلاف امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک عزل اور خروج دونوں جائز ہیں۔ مگر اس میں شرط یہ ہے کہ عزل اور خروج موجب فتنہ نہ ہوں۔ اور چونکہ فی زماننا ہر خروج اپنے ساتھ بہت سے فتنے لیکر نمودار ہو جاتا ہے۔ اس لیے بعض احنافؒ نے تو یہاں تک کہدیا کہ: اما الخروج علی الامراء فمحرم باجماع المسلمین وان کانوا فسقۃ ظالمین اھ (مرقات)، اس لیے ایسی حکومتوں میں محض زبانی طور پر فریضہ تبلیغ ادا کرنا کافی ہوگا۔

مسلمان باغیوں کے بارے میں جہاں تک میں نے امام اعظمؒ کا مسلک سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ جن صورتوں میں بغاوت ناجائز ہو اور امام سے کوئی بغاوت کی جائے تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جو لوگ بغاوت کے مرتکب ہو چکے ہوں۔ ان کا قتل جائز ہے۔ البتہ جو افراد بغاوت میں باغیوں کے ساتھ شریک نہ ہوئے ہوں ان کو قتل کرنا جائز نہیں۔ خواہ وہ چھوٹے بچے اور عورتیں ہوں یا بوڑھے اور اندھے ہوں۔ یا دوسرے بالغ مرد ہوں جو بغاوت میں باغیوں کے ساتھ شریک نہ ہوں۔ اس کے ثبوت کے لیے بطور حوالہ فقہائے حنفیہ کی درج ذیل عبارات ملاحظہ فرمائی جائیں: امام سرخسیؒ مبسوط ج ۱۰ ص ۱۲۴ میں لکھتے ہیں: فان کان المسلمون مجتمعین علی واحد وکانوا آمنین بہ والسبیل آمنۃ فخرج علیہ طائفۃ من المسلمین فحینئذٍ یجب علی من یقوی علی القتال ان یقاتل مع امام المسلمین الخارجین۔ اھ وجوب قتال کے لیے امام سرخسیؒ نے تین دلائل بیان کیے ہیں، جن میں سے ایک دلیل یہ آیت کریمہ ہے: فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰى تَفِیْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ۔ دوسری دلیل امام موصوف نے وجوب قتال کے لیے یہ بیان کی ہے: ولان الخارجین قصدوا اذی المسلمین واماطۃ الاذی من ابواب الدین۔ وخروجھم معصیۃ ففی القیام بقتالھم نھی عن المنکر وھو فرض۔ اور تیسری دلیل یہ بیان فرمائی ہے: ولانھم یھیجون الفتنۃ قال صلی اللہ علیہ وسلم الفتنۃ نائمۃ لعن اللہ من ایقظھا۔ فمن کان ملعونا علی لسان صاحب الشرع صلعم یقاتل معہ اھ۔ ان تمام عبارات سے یہ تو واضح ہو گیا کہ باغیوں کے ساتھ قتال واجب ہے۔ اور قتال شرعی نقطۂ نگاہ سے ان لوگوں کے ساتھ جائز ہو سکتا ہے جو معصوم الدم نہ ہوں۔ اس کی طرف حضورؐ کے درج ذیل ارشاد میں اشارہ کیا گیا ہے:۔ اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حتی یقولوا لا الٰہ الا اللہ

وان محمداً رسول اللہ فاذا فعلوا ذالك عصموا منی دماءھم و اموالھم الحدیث ۔ پس جب باغیوں کے ساتھ قتال واجب ہو گیا تو معلوم ہوا کہ ان کو جان کی پوری عصمت حاصل نہیں ہے تو قتل بھی جائز ہو گا یہی وجہ ہے کہ فقہاء مذہب حنفی صریح طور پر اپنی کتابوں میں لکھتے ہیں کہ باغیوں کا قتل جائز ہے ۔ صاحب بدائع الصنائع باغیوں کے قتل کے متعلق لکھتے ہیں :۔ واما بیان من یجوز قتله منھم ومن لا یجوز فکل من لا یجوز قتله من اھل الحرب من الصبیان والنسوان والاشیاخ والعمیان لا یجوز قتله من اھل البغی ۔ لان قتلھم لدفع شر قتالھم فیختص باھل القتال وھؤلاء لیسوا من اھل القتال فلا یقتلون الا اذا قاتلوا فیباح قتلھم فی حال القتال وبعد الفراغ من القتال اھ (ج ۷ ص ۱۴۱)

فقہاء کی ان تصریحات کے پیش نظر باغیوں کے متعلق امام ابو حنیفہؒ کا مذہب صاف طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان باغیوں پر اگر اسلامی حکومت غالب آجائے تو وہ تمام ان بالغ مردوں کو قتل کر کے ان کے مال لوٹ لینے کی مجاز ہے جو بغاوت کے مرتکب ہو چکے ہوں ۔ قطع نظر اس سے کہ ان مسلمان باغیوں نے پہلے خود یہ شرط قبول کی ہو یا نہ کی ہو ۔ مگر یہ قتال اور قتل اس وقت تک جاری رہے گا جبتک کہ باغی لوگ ہتھیار نہ ڈالیں اور جب وہ ہتھیار ڈالیں گے تو قتل و قتال بھی بند کر دیا جائے گا

البتہ ان کا مال بطور غنیمت تقسیم نہیں کیا جائے گا ۔ بلکہ جنگ ختم ہونے یا ہتھیار ڈالنے کے بعد انہیں واپس کیا جائے گا وکذالك ما اصیب من اموالھم یرد الیھم لانه لم یتملك ذالك المال علیھم لبقاء العصمة بالدار والاحراز فیه اھ (مبسوط ج ۱۰ ص ۱۲۶) فقہاء کی یہ تصریحات اگر امام ابو حنیفہؒ کے مذہب کی صحیح ترجمانی پر مشتمل ہوں ، جیسا کہ ہمارا یقین ہے تو ان کے ہوتے ہوتے عقل کیسے یہ باور کر سکتی ہے کہ موصل میں بغاوت مسلمانوں نے کی تھی اور منصور کے ساتھ چونکہ وہ یہ شرط کر چکے تھے کہ اگر ہم نے آئندہ کبھی آپ کے خلاف خروج کر دیا تو ہمارے خون اور مال آپ کے لیے حلال ہوں گے ۔ اس لیے فقہاء کے سامنے یہ سوال پیش کیا گیا کہ قتال کے بعد ان باغیوں کی جان اور مال پر ہاتھ ڈالنا جائز ہو گا یا نہیں ، اور اسی کے متعلق منصور کے استفسار پر امام ابو حنیفہ نے یہ فتویٰ دیا تھا کہ ان کے خون اور مال آپ کے لیے حلال نہیں ہیں ؟

پھر یہ بات بھی کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ آپ شمس الائمہ سرخسی کے بیان کو صرف اس بنا پر قابل

اعتماد نہیں سمجھتے ہیں کہ ان کا بیان اہلِ تاریخ سے مختلف ہے۔ حالانکہ بغاوت جیسے اہم معاملہ میں فقہاء کی جماعت میں سے ایک بڑے فقیہ اور امام اعظمؒ جیسے امامِ فقہ کا مذہب معلوم کرنے میں ان فقہاء کے قول پر زیادہ اعتماد کرنا چاہیے جو اس امام کے مذہب سے وابستہ رہے ہوں۔ تاریخ کے واقعات مرتب کرنے میں غلطیاں زیادہ سرزد ہو سکتی ہیں بہ نسبت اس کے کہ ایک امامِ مذہب کی فقہی مرویات مرتب کرنے میں غلطیاں واقع ہوں۔ پھر یہ واقعہ جس طرح کہ مبسوط میں امام سرخسیؒ نے نقل کیا ہے بعینہٖ اسی طرح شیخ ابن ہمامؒ نے فتح القدیر (ج ۵ ص ۳۳۴) میں بھی نقل کیا ہے۔ ان دونوں اماموں کے مقابلہ میں ابن اثیر یا الکردری کے قول کو ترجیح دینا یقیناً ہمارے فہم سے بالاتر ہے"۔

جواب ۔ امام ابوحنیفہؒ کے مسلک درباب خروج کے بارے میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس کے متعلق مزید کچھ عرض کرنے سے پہلے مَیں چاہتا ہوں کہ آپ دو تین باتوں پر بھی کچھ روشنی ڈال دیں۔

اوّل یہ کہ ابوبکر جصّاص، الموفق المکی، اور ابن البزاز الکردری کا شمار بھی فقہائے حنفیہ میں ہوتا ہے یا نہیں؟ آپ سے یہ مخفی نہیں ہو سکتا کہ ابوبکر جصاص متقدمینِ حنفیہ میں سے ہیں، ابوسہل الزجاج اور ابوالحسن الکرخی کے شاگرد ہیں اور اپنے زمانے میں (۳۰۵-۳۷۰ھ) امامِ اصحابِ ابی حنیفہ تسلیم کیے جاتے تھے۔ ان کی کتاب احکام القرآن کا شمار حنفیہ ہی کی فقہی کتابوں میں ہوتا ہے۔ الموفق المکی (۴۸۴-۵۶۸ھ) بھی فقہائے حنفیہ میں سے تھے اور القفطی کے قول کے مطابق "کانت له معرفة تامة فی الفقه والادب"۔ الکردری کا شمار بھی فقہائے حنفیہ میں ہوتا ہے اور ان کی فتاویٰ بزازیہ، آداب الفقہاء اور مختصر فی بیان تعریفات الاحکام، معروف کتابیں ہیں۔ میں نے جو مواد ان تین حضرات کی کتابوں سے بحوالہ نقل کیا ہے، میں چاہتا ہوں کہ اس کی حیثیت پر بھی آپ کچھ روشنی ڈالیں۔

دوم یہ کہ حضرت زید بن علی بن حسین، اور نفس زکیہ کے خروج کے واقعات میں امام اعظم رحمہ اللہ کا جو طرزِ عمل مذکورۂ بالا تینوں مصنفین اور بہت سے دوسرے مؤرخین نے بیان کیا ہے، اس کو آپ صحیح اور معتبر تاریخی واقعات میں شمار کرتے ہیں یا نہیں۔ اگر یہ واقعات غلط ہیں تو آپ ان کی تردید کسی مستند ذریعہ سے فرمائیں۔ اور اگر یہ صحیح ہیں تو امام اعظم کا مسلک سمجھنے میں ان سے مدد لی جا سکتی

ہے یا نہیں ؟ یہ بات تو بہر حال امام ابو حنیفہ جیسی عظیم شخصیت کے متعلق باور نہیں کی جا سکتی کہ ان کا فقہی مسلک کچھ ہو اور عمل کچھ ۔ لہٰذا دو باتوں میں سے ایک بات ماننی ہی پڑے گی ۔ یا تو یہ واقعات غلط ہیں ۔ یا پھر امام کے مسلک کی صحیح ترجمانی وہی ہو سکتی ہے جو ان کے عمل سے مطابقت رکھتی ہو ۔

اہلِ موصل کے بارے میں شمس الائمہ سرخسی نے جو کچھ لکھا ہے ، اس کے متعلق میں اتنا ہی کہوں گا کہ دوسرا بیان الکرْدَری کا ہے ، اور وہ بھی نرے مؤرخ نہیں بلکہ فقیہ بھی ہیں ۔ الکرْدَری لکھتے ہیں کہ منصور نے فقہاء کے سامنے یہ سوال پیش کیا تھا " الیس صح انه علیه السلام قال المومنون عند شروطهم ؟ واهل موصل شرطوا علی ان لا یخرجوا علی وقد خرجوا علی عاملی وقد حل لی دماءهم " ۔ امام ابو حنیفہؒ نے جواب میں فرمایا : " انهم شرطوا لك مالا یملکونه یعنی دماءهم فانه قد تقرر ان النفس لا یجری فیها البذل والاباحة علی ان الرجل اذا قال لآخر اقتلنی فقتله تجب الدیه ، وشرطت علیهم مالیس لك لان دم المسلم لا یحل الا باحدی معان ثلاث فان اخذتهم اخذت بما لا یحل ، وشرط الله احق ان توفی به (مناقب الامام الاعظم ج ۲، صفحہ ۱۶ - ۱۷) ۔ اس عبارت میں سائل اور مفتی دونوں نے تصریح کی ہے کہ معاملہ مسلمانوں سے متعلق تھا ۔

سوال ۱۲ : گرامی نامہ ملا ۔ آپ نے جن باتوں کی طرف توجہ دلائی ہے اُن کے متعلق مختصراً عرض ہے کہ ابوبکر جصاص ، الموفق المکی ، اور ابن البزاز الکردری کا شمار یقیناً فقہاءؒ میں ہوتا ہے ۔ اسی طرح احکام القرآن اور دوسری وہ کتابیں جن کا آپ نے ذکر فرمایا ہے ، بھی معروف کتابیں ہیں ۔ لیکن با ایں ہمہ رتبہ اور درجہ کے لحاظ سے ان حضرات کا مقام امام سرخسیؒ کے مقام سے بہت فروتر ہے ۔ اسی طرح امام سرخسیؒ کی کتاب المبسوط کا درجہ اور مرتبہ احکام القرآن وغیرہ کتبِ مذکورہ سے محققینِ احنافؒ کے نزدیک بہت بلند اور مقام بہت اونچا ہے ۔ اس لیے فقہیات میں امام اعظمؒ کے مسلک کو متعین کرنے میں مبسوط سرخسیؒ ہی کا فیصلہ معتبر اور قابلِ اعتماد ہوگا نہ کہ احکام القرآن وغیرہ کتب کا ۔ علامہ ابن عابدین شامیؒ نے محقق ابنِ کمال سے

طبقات الفقہاء کی تفصیل نقل کرتے ہوتے امام سرخسی کو تیسرے طبقہ میں شمار کیا ہے جو مجتہدین فی المسائل کا طبقہ ہے اور ابوبکرؒ جصاص رازی کو چوتھے طبقے میں شمار کیا ہے جو محض مقلدین کا طبقہ ہے۔

اِن تصریحات کے پیشِ نظر خروج کے مسئلہ میں امام اعظمؒ کا مذہب وہ قرار دیا جائیگا جو مبسوط میں ذکر کیا گیا ہے، نہ کہ وہ جو احکام القرآن یا دوسری تاریخوں میں بیان کیا گیا ہے۔

رہا حضرت زید بن علی بن الحسین اور نفس زکیہ کے خروج کے واقعات میں امام ابو حنیفہؒ کا طرزِ عمل، تو اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ تاریخی لحاظ سے میں اس کو سو فی صد صحیح اور درست سمجھتا ہوں۔ تمام مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ نے ان دونوں کے خروج میں ان کی حمایت کی تھی۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس مسئلہ کی فقہی نوعیت تاریخی نوعیت سے بالکل مختلف ہے۔ فقہ حنفی کی تمام معتبر کتابوں میں حتیٰ کہ کتب ظاہر الروایۃ میں خروج کے متعلق امام ابو حنیفہؒ کا مذہب یہ بیان کیا گیا ہے کہ امام عادل تو درکنار ظالم اور متغلب سے بھی خروج ناجائز اور بغاوت حرام ہے۔ لہٰذا ہمیں ان دو متضاد بیانات کے مابین یا تطبیق سے کام لینا پڑے گا یا ترجیح سے۔ جہاں تک ترجیح کا تعلق ہے، ہم فقہاء کے مسلمہ اصول کے پیشِ نظر فقہاء مذہبِ حنفی کے بیان کو مؤرخین کے بیان پر اس لیے ترجیح دیں گے کہ مذہب کی تعیین میں ناقلینِ مذہب کا قول زیادہ قابلِ اعتماد ہے۔ اور مؤرخین میں سے جو فقہاء ہیں، جیسے ابوبکر رازی، الموفق المکی اور ابن البزاز، تو یہ چونکہ رتبہ اور درجے کے اعتبار سے اصل ناقلینِ مذہب کے ہمسر نہیں ہیں اس لیے ان کا نقل بھی دوسروں کے مقابلہ میں قابلِ اعتبار نہیں سمجھا جائیگا گو تاریخی نقل اور روایت اصولِ روایت کے لحاظ سے قوی کیوں نہ ہو۔

اور اگر ہم تطبیق کا طریقہ اختیار کریں گے تو میرے ذہن میں تطبیق کے لیے بہتر طریقہ یہ ہے کہ چونکہ زید بن علی کے خروج کا واقعہ بقول آپ کے صفر ۱۲۲ھ میں پیش آیا تھا۔ اور نفس زکیہ کے

خروج کا واقعہ جیسا کہ آپ نے لکھا ہے ۱۴۵ھ میں ظاہر ہوا تھا ۔ اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بقول ابن کثیرؒ (البدایہ ج ۱۰ ص ۱۰۷) ۱۵۰ھ میں وفات پا چکے ہیں ۔ اس طرح خروج نفس زکیہ کے بعد امام کم سے کم پانچ سال تک زندہ رہ چکے ہیں ۔ اس بنا پر ہو سکتا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے اپنی آخری عمر میں سابق رائے میں تبدیلی کر کے خروج کے متعلق اپنا جدید مسلک یہ متعین کیا ہو کہ "خروج اور بغاوت حرام ہے نہ کہ جائز" اور اپنے پہلے مسلک سے امام نے رجوع کیا ہو ــــ اور اس وقت سے امام اعظم بھی دوسرے محدثین کی طرح اس بات کے قائل رہے ہوں کہ "خروج جائز نہیں بلکہ حرام ہے ۔ اور اصلاح کے لیے خروج کے بجائے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے ہی کام لیا جائے گا" شاید اسی وجہ سے ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہو : واما الخروج علیھم فحرم باجماع المسلمین وان کانوا فسقۃ ظالمین (مرقات)

اوپر کے مباحث سے جب یہ بات واضح ہو گئی کہ خروج کے مسئلہ میں امام اعظم کا مذہب عدم جواز ہے ۔ اور مسلمان باغیوں کا حکم تصریح فقہاء قتل ہے جیسے سابق مکتوب میں فقہاء کے حوالے ذکر کیے جا چکے ہیں تو اہل موصل کے معاملہ میں بھی میرے نزدیک امام سرخسیؒ اور شیخ ابن الہمامؒ کا بیان درست ہے کہ یہ واقعہ مشرکین کے یرغمالوں سے متعلق تھا نہ کہ مسلمان باغیوں سے ۔ کیونکہ مسلمان باغیوں کے بارے میں امام کا مذہب یہ ہے کہ انہیں قتل کیا جائے گا نہ یہ کہ ان کا قتل جائز نہیں ہے " اگرچہ الکردری کے بیان کے مطابق یہ واقعہ مسلمان باغیوں سے متعلق معلوم ہوتا ہے "

جواب ۔ عنایت نامہ ملا ۔ میرا خیال ہے کہ اب میرا نقطۂ نظر اچھی طرح آپ کے سامنے واضح ہو سکے گا ۔ براہ کرم حسب ذیل امور پر غور فرمائیں ۔

میرے مقالے کا موضوع ہے اس خاص مسئلے میں امام ابو حنیفہؒ کا مسلک ۔ اور آپ استدلال میں پیش فرما رہے ہیں مذہب حنفی کے اقوال ۔ آپ جیسے ذی علم اور فقیہ النفس بزرگ سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہو سکتی کہ مسلک ابی حنیفہ اور مذہب حنفی ایک چیز نہیں ہیں ۔ مسلک ابی حنیفہ کا

اطلاق صرف امام اعظم کے اپنے اقوال و افعال پر ہی ہو سکتا ہے ۔ رہا مذہبِ حنفی تو اس میں امام صاحب کے علاوہ اصحاب ابی حنیفہ اور بعد کے مجتہدین فی المذہب بھی شامل ہیں، اور بہت سی ایسی چیزیں بھی مذہب حنفی قرار پائی ہیں جو امام اعظم سے ہی نہیں، آپ کے اصحاب سے بھی ثابت نہیں ہیں، حتیٰ کہ ایسے مسائل بھی موجود ہیں جن میں مذہبِ حنفی کا فتویٰ امام اعظم کے قول کے خلاف ہے ۔

ابوبکر جصاص، الموفق المکی اور ابن البزاز رحمہم اللہ چاہے درجۂ اول کے فقیہ نہ ہوں لیکن اس درجہ فقہ سے نابلد تو نہیں ہو سکتے کہ اپنے مذہب کے سب سے بڑے امام سے وہ اقوال اور افعال بلاتحقیق منسوب کر دیتے جو ان کے تحقیق شدہ مسلک کے خلاف ہوتے ۔ خصوصاً جصاص رحمۃ اللہ تو امام اعظم سے بہت قریب زمانے میں گزرے ہیں ۔ امام کی وفات اور ان کی پیدائش کے درمیان صرف ۱۵۵ سال کا فاصلہ ہے ۔ اور بغداد میں وہ ان اکابر احناف سے وابستہ رہے ہیں جن کے درمیان مدرسۂ ابی حنیفہ کی روایات پوری طرح محفوظ تھیں ۔ اگر امام صاحب کی طرف کوئی غلط روایت افواہ کے طور پر منسوب ہوتی تو وہ آخری شخص ہوتے جو اسے حاطب اللیل کی طرح احکام القرآن جیسی اہم فقہی کتاب میں نقل کر بیٹھتے ۔ اور اگر امام اعظم کا اس مسلک سے رجوع ثابت ہوتا تب بھی وہ اس سے نہ بے خبر رہتے اور نہ اس کو چھپاتے ۔

امام کے رجوع کا گمان اس لیے بھی صحیح نہیں ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو منصور ان کی جان کے درپے نہ رہتا بلکہ اس کے بعد تو اُس کے اور امام کے درمیان صلح ہو جاتی ۔ مزید براں کسی نے اشارۃً و کنایۃً بھی یہ نقل نہیں کیا ہے کہ امام نے کبھی نفسِ زکیہ کے خروج میں حصہ لینے کو غلط تسلیم کیا ہو ۔

میرے نزدیک یہ امر تو شبہ سے بالاتر ہے کہ مسئلۂ زیرِ بحث میں امام اعظم کا مسلک وہی تھا جو ان کے نقل شدہ اقوال و افعال سے ثابت ہے ۔ البتہ مذہب حنفی بعد میں وہی قرار پایا ہے جو آپ نقل فرما رہے ہیں ۔ اور یہ مذہب قرار پانے کی وجہ یہ ہے کہ امام صاحبؒ کے دور میں جو رائے اصحاب حدیث کے ایک گروہ کی تھی (جیسے امام اَوزاعی کے حوالہ سے میں نے اپنے مضمون میں نقل بھی کیا ہے) دوسری صدی کے آخر تک پہنچتے پہنچتے وہی رائے اہلِ سنت والجماعت کے پورے گروہ

میں مقبول ہوگئی اور اسی رائے کو متکلمین میں سے اشاعرہ نے (بمقابلہ معتزلہ) اختیار کیا۔ اس رائے کی مقبولیت درحقیقت نصوصِ قطعیہ پر مبنی نہیں ہے بلکہ اُن تجربات کا اس میں بہت بڑا دخل ہے جو خُروج کے واقعات کے سلسلے میں مسلسل ہوتے رہے تھے۔ اس بنا پر مصالحِ شرعیہ کا تقاضا وہی کچھ سمجھا گیا جو فقہائے کرام نے بیان کیا ہے۔ لیکن مجھے اس امر کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ ائمہ جور کے خلاف خروج کے معاملہ میں پہلی صدی ہجری کے آئمہ و اکابر کی وہ رائے ہو جو بعد والوں نے قائم کی۔

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ۱۹۵۷ء کے اواخر میں جو بین الاقوامی مجلسِ مذاکرہ لاہور میں ہوئی تھی اس میں انگلستان کی ایک مستشرقہ نے باقاعدہ یہ اعتراض کیا تھا کہ اسلامی نظامِ حکومت اگر ایک دفعہ بگڑ جائے تو پھر اس کی تبدیلی کی کوئی صورت اسلام میں نہیں ہے۔ اس اعتراض کے حق میں اشاعرہ اور فقہائے اہلِ سنت کے اقوال پیش کرتے ہوئے اس نے کہا تھا کہ بگاڑ رونما ہو جانے کی صورت میں فقہاء کی ان تصریحات کے مطابق صرف انفرادی طور پر کلمۂ حق تو بلند کیا جا سکتا ہے مگر کوئی اجتماعی سعی نہیں ہو سکتی۔ ہمارے پاس اس کا کوئی جواب مسلکِ ابی حنیفہ کو پیش کرنے کے سوا نہ تھا۔ اب اگر یہ بھی غلط ہو تو پھر اس اعتراض کا کوئی جواب ہمیں آپ بتائیں۔

قتال اہل البغی کے معاملہ میں یہ امر تو مسلَّم ہے کہ اگر وہ مسلح ہو کر مقابلہ کریں تو ان کے لڑنے والوں کو قتل کیا جا سکتا ہے اور ان کے برسرِ جنگ لوگوں کے مال بھی لُوٹے جا سکتے ہیں لیکن کیا یہ بات بھی صحیح ہے کہ جس علاقے میں انہوں نے بغاوت کی ہو اس علاقے کی ساری آبادی مباح الدم والاموال ہو جاتی ہے اور ان کا قتلِ عام کیا جا سکتا ہے؟ اگر حکم فقہی کی تعبیر یہی ہو تو پھر یزید کی فوجوں نے واقعۂ حرہ کے موقع پر مدینۂ طیبہ کی آبادی کے ساتھ جو کچھ کیا وہ جائز ہونا چاہیے۔ اس پر صحابہ و تابعین اور بعد کے علماء و فقہاء نے جو شدید اعتراضات کیے ہیں ان کا پھر کیا جواز ہے؟

ضروری اعلان

ماہنامہ ترجمان القرآن کے مندرجہ ذیل پرانے پرچے نصف قیمت پر دفتر سے دستیاب ہو سکتے ہیں۔ فائل رکھنے کے خواہشمند حضرات توجہ فرمائیں:

١ -	اپریل ۵۹ء	جلد ۵۲	عدد ١
٢ -	مئی 〃	〃	〃 ٢
٣ -	جون 〃	〃	〃 ٣
۴ -	جولائی 〃	〃	〃 ۴
۵ -	اگست 〃	〃	〃 ۵
۶ -	ستمبر 〃	〃	〃 ۶
۷ -	اکتوبر 〃	جلد ۵۳	عدد ١
۸ -	نومبر 〃		〃 ٢
۹ -	دسمبر 〃	〃	〃 ٣
١٠ -	فروری ۶۰ء	〃	〃 ۵
١١ -	مارچ 〃	〃	〃 ۶
١٢ -	اپریل 〃	جلد ۵۴	〃 ١
١٣ -	مئی 〃	〃	〃 ٢
١۴ -	ستمبر ۶۰ء	جلد ۵۴	عدد ۶
١۵ -	اکتوبر ۶۰ء	جلد ۵۵	〃 ١
١۶ -	دسمبر ۶۰ء	〃	〃 ٣
١۷ -	فروری ۶۱ء	〃	〃 ۵
١۸ -	مارچ 〃	〃	〃 ۶
١۹ -	مئی 〃	۵۶ 〃	〃 ٢
٢٠ -	جون 〃	〃	〃 ٣
٢١ -	جولائی 〃	〃	〃 ۴
٢٢ -	اگست	〃	〃 ۵
٢٣ -	ستمبر 〃 (نمبر)	〃	۶
٢۴ -	اکتوبر 〃	جلد ۵۷	〃 ١
٢۵ -	نومبر 〃	〃	〃 ٢
٢۶ -	دسمبر 〃	〃	〃 ٣

نوٹ: دسمبر ۶۱ء سے دسمبر ۶۳ء تک کے پرچے پوری قیمت پر دفتر سے ملیں گے۔

مینجر ترجمان القرآن، اچھرہ۔ لاہور

دین کا شعور و فہم حاصل کرنے کے لیئے نادر کتب

تفہیمات

از مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

= قرآن مجید کے اہم مسائل کی دل نشیں تفہیم۔

= نبوتِ محمدی کے اثبات اتباع و اطاعت پر سیر حاصل بحث۔

= مختلف اہم موضوعات پر اسلامی نقطۂ نظر کی تشریح و توضیح ۔ حصہ اول: قیمت مجلّد اعلیٰ ۵۰/۷ سستا ۵۰/۵

تنقیحات

از مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

= اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم سے پیدا شدہ مسائل پر بصیرت افروز تبصرہ۔

= ملّتِ اسلامیہ کے زوال و انحطاط کے اسباب کا بے لاگ جائزہ۔

= مغربی تہذیب پر بھرپور تبصرہ۔

قیمت: ۴/۵۰ - سستا اڈیشن:- ۲/۲۵

اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر

از مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

- عبادت کا جاہلی اور اسلامی تصور۔
- اسلام میں عبادت کا حقیقی مقام
- انسانی زندگی پر عبادات کا اثر۔
- دین کا شعور حاصل کرنے کے لیے ایک بیش قیمت کتاب۔ معیاری کتابت و طباعت

قیمت ۱/۷۵

تجدید و احیائے دین

از مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

- تجدید و احیائے دین کی حقیقت اور اسکی اہمیت
- مجدّدینِ ملّت کے کارناموں کا تحقیقی جائزہ
- تاریخِ اسلام کا بصیرت افروز مطالعہ۔

صفحات ۱۹۲

قیمت مجلّد ۲/۷۵ روپے۔ سستا ایڈیشن ۱/۷۵ روپے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ - شاہ عالم مارکیٹ لاہور

OUR ENGLISH PUBLICATIONS

1. Islamic Law and Constitution

(2nd Revised & Enlarged Edition) By Abul A'la Maududi
Translated and Edited By Khurshid Ahmad, M.A.LL.B.

* What is the nature of an Islamic State ?
* What are the bases & Sources of Islamic Law & Constitution ?
* What are the Rights & Privileges of Non-Muslims in an Islamic State?
* What are the Salient features of an Islamic State ?
* An invaluable book for the students of Political Science.
* A book sought for by the Legislatures of almost all important countries of the World.

Medium 8 Vo : PP. 448. Rs. 12.00

2. Towards Understanding Islam

(8th Edition) By Abul A'la Maududi

Translated & Edited By Khurshid Ahmad, M.A.LL.B.

* A concise and authoritative introduction of Islam.
* A brief & lucid discussion of the Principles of Islamic Ideology.
* Comprehensive and all embracing view of Islam as a way of life.
* Translated into 18 Important languages of the World.
* More than 1, 00, 000 copies sold all over the World.

Crown 8 Vo : PP. 204 Rs. 4 50

3. Process of Islamic Revolution

By Abul A'la Maududi

* What are the pre-requisites of an Islamic Revolution ?
* The Ideological aspect of an Islamic State.
* A guide Book for all those persons who wish to know the real nature and process of Islamic Revolution.

Crown 8 Vo : PP. 60 Re. 0.87

4. The Economic Problem of Man and Its Islamic Solution

By Abul A'la Maududi

* The Nature & Importance of Economic problems in human life.
* Islamic Solution of the Economic problem and its salient features.
* A brief & concise but comprehensive discussion of the topic.

Crown 8 Vo : PP. 64. Re. 75

5. Principles of Islamic Education

By Khurshid Ahmad M.A.LL.B.

* What is the importance of Education in National life.
* What is the purpose of Education.
* Basic Principles & aims of Education in Islam.
* An essential Book for Educationalists and Students.

Demy 8 Vo : PP. 28 Re. 1.00

Islamic Publications Limited

3-E, Shahalam Market, Lahore (W. Pakistan)